ناکام

از

خواجہ محمد شفیع دہلوی

مصنف دلّی کا سنبھالا، گناہ، ہم اور وہ، روپ متی وغیرہ

شیخ غلام محمد اینڈ سنز تاجران کتب
مائسمہ بازار امیرا کدل سرینگر کشمیر

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

قیمت ۱۲ | سنہ ۱۹۴۱ء | اوّل ۵۰۰

Cat 05
U3 D59N
JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
24346
20.1.59
SRINAGAR
ST 01
IM
U3
M893N
CHECKED
Cat 05

ملنے کا پتہ

خواجہ محمد شفیع

اُردو مجلس پبلشرز۔ مٹیا محل۔ دہلی

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

ہم سب دریا کنارے بیٹھے تھے، ایک لہر اُبھرتی۔ دوسری اسے دبا دیتی پھر خود بھی نیچا دیکھتی۔ یوں ہی ایک دوسری کو پامال کرتی اور پامال ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ دریا نام تھا اس لامتناہی سلسلہ کا۔ بلبلہ سر اٹھاتا۔ دبا دیا جاتا۔ اپنی سطح سے ابھرتا ٹھکرا دیا جاتا۔ آنکھ بند کر کے اٹھتا۔ آنکھ کھلتے ہی اپنے کو غرق آب پاتا۔ خیرہ سر سر شکستہ ہوتا۔ بادِ غرور ابھارتی۔ حقیقت چشم کشائی کرتی۔ ہوا ساتھ نہ دیتی۔ پانی کا پانی رہ جاتا۔

باتیں ہو رہی تھیں۔ کڑھائی چڑھی تھی۔ نوکر گرم گرم پکوان لا رہے تھے ایک صاحب چٹنی سالن کی طرح کھا رہے تھے۔ میں بھی ان کی اس مردانہ جرأت پر چھوٹی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ اب انھوں نے پوری پوری مرچیں چبانی شروع کر دیں جس طرح بھانمتی چیز غائب کر کے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ بھی ہر مرچ کھا جانے کے بعد ہماری جانب اُلّو کی طرح دیکھتے تھے۔ مجھ پر اپنی برداشت کا سکّہ جما رہے تھے۔ اس بیوقوف میں اتنی برداشت نہ تھی کہ جذبۂ خود نمائی کو دباتا۔ مرچیں تو طوطا بھی کھا لیتا ہے۔

ایک اپنی پرخوری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ رکابیوں پر رکابیاں صاف

کرتے چلے جاتے۔ ساتھ کے ساتھ یہ بھی اعلان فرماتے تھے کہ چاہنے والی بیوی نے اچھی طرح پیٹ بھر کر بھیجا تھا اور کہہ دیا تھا کہ سب کے سامنے زیادہ نہ کھانا نظر لگ جائے گی۔

اللہ تمہارے اکلوتے ارنے بھینسے کو نظرِ بد سے بچائے۔ لیکن بہن دوزخِ شکم بھرنے سے کام نہیں بنے گا۔ اگر ہوسِ مرد بھر سکو تو بھرو۔ جو کام نہ تمہارے بس کا ہے نہ میرے۔

ایک نے کہا کاظم صاحب نہیں آئے۔ دوسرا بولا وعدہ تو کیا تھا۔ پر آج کل انھیں فرصت کم ہے۔ دن بھر کام میں رندھے رہتے ہیں۔ کئی کتابیں شروع کر رکھی ہیں۔ پر صاحب لکھتا غضب کا ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ کیا طبیعت کی باگیں موڑی ہیں۔ خوش وقت رنگین انسان چوبیس ۲۴ گھنٹے گلچھروں میں رہنے والا، اب اِدھر کا رُخ بھی نہیں کرتا۔ میز ہے اور وہ۔ جب جا کر دیکھو بیٹھا کام کر رہا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اس کی صحت پر بھی اثر پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا خیال کرو چار پانچ گھنٹے اکھاڑے میں ورزش کرنے والا انسان جو یک قلم اس طرف سے ہاتھ اٹھالے تو آپ سے آپ صحت خراب ہو گی۔ میں نے پوچھا کوئی ایڈیٹر ہیں۔ جواب ملا نہیں۔ کتابیں لکھتا ہے مصنّف ہے۔ پر ظالم نے جو کام کیا حد کو پہنچا دیا۔ ورزش کی تو وہ ایسی ہی۔ آپ لوگوں سے شوق کیا تو کوئی گھر نہ چھوڑا۔ ہے دھن کا پکا۔ جدھر لگ گیا لگ گیا۔ میں نے کہا کسی راگ میں پڑے ہی نہ ہوں گے ورنہ ساری دھنیں بھول جاتے۔ ایک مضراب کی چوٹ ساری عمر آس دیتی

رہتی ہے۔ کسی چکاری سے واسطہ ہی نہیں پڑا نہیں تو ساری چوکڑی بھول جاتے۔

ایک نے کہا یادش بخیر وہ چلے آتے ہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ✤ بسا کیں دولت از گفتار خیزد

باتیں سُنکر دل میں خواہش دیدار پیدا ہو گئی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایک متوسط قدو قامت کا انسان آتا نظر آیا۔ قریب آیا تو خط و خال ظاہر ہوئے آنکھیں شوخ تھیں ولے چہرہ متین۔ نقش و نگار سے فراست آشکار۔ چال میں بغیر تصنع کے دلبری۔ جوں جوں قریب آتا گیا چہرے پر مُسکراہٹ کھیلتی گئی، لیکن دماغی تکان کا سایہ کچھ اس طرح جھلک رہا تھا جیسے موتی میں زردی میری طرف نگہ غلط انداز ڈالی اور آنکھیں بچالیں۔

عام دستور اس کے خلاف ہے۔ لوگ میری طرف گھورا کرتے ہیں۔ یہ اپنے دوستوں سے متوجہ ہوا۔ دیر میں آنے کی معافی چاہی۔ اظہارِ مجبوری و معذوری کیا۔ ایک نے شکایت کی کہ اب تو جناب کی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ نہایت سادگی سے جواب دیا بندہ نواز اگر شیو کرنے کی لعنت نازل نہ ہو تو شاید میں خود بھی اپنی صورت کو ترسوں۔

عجب جاذب انسان ہے۔ سب اس کی جانب رجوع ہو گئے۔ میں پس منظر میں رہ گئی۔ ایسا کم ہوتا ہے۔ دل میں رشک و حسد پیدا ہوا۔ آخر کار وہ میری طرف ملتفت ہوا تو سب نگاہیں بھی ادھر پھریں۔ بولا جناب اُس روز آپ ہی کا ذکر خیر فرما رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ جی ہاں یہی وہ زہرہ ہیں

جن کے ہم سب مشتری ہیں۔ اک ادائے خاص سے جواب دیا، کیا عرض کروں، مجھے تو آپ بنات النعش معلوم ہوتے ہیں۔ میں جلی تو بیٹھی ہی تھی فوراً کہہ اٹھی کہیں غالب کا یہ شعر نہ صادق آجائے۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردہ میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

جواب ملا رات ہونے دیجئے۔

وہ محفل پر چھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں اپنے کو کچھ چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ تفوق قائم رکھنے کے لئے بولی اور جناب مریخ ہیں۔ جواب ملا جی نہیں عطارد، دبیر فلک۔

دماغ ہاتھ پیر ڈالے دیتا تھا۔ رشک کچوکے دے رہا تھا۔ میں نے کہا سیاہی درکار ہے۔ بولا جی نہیں روشنائی۔

میں نے کہا ماشاءاللہ آسمان پر دماغ ہے جواب دیا کہ قرین زہرہ بھی تو ہوں۔

اس فقرے کے ساتھ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ میں آپ کے بس کا نہیں ہوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صلح و آشتی کر لیں۔ بس بہت ہو چکی۔

میں نہ شکست ماننے کی عادی نہ ہتھیار ڈالنے کی خوگر اور پھر اتنوں کے سامنے پسپائی کا اعتراف۔ دل نہ مانا۔ ایک صاحب بولے کیوں بی زہرہ آج ملا ہے سیر کو سوا سیر۔ ان کی کپڑے کی دکان تھی اور اکثر احباب

انھیں دھجی پھٹ کہتے تھے۔ میں نے جواب دیا جناب کو سیر سوا سیر سے کیا کام۔ آپ تو گز سواگز کی فکر کیجئے کہیں اپنا تھان نہ بھول جائیں۔

اس وقت مجھے یہ سب بُرے لگ رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ کاظم ہو اور میں ہوں اور ساری عمر اس سے ضلع جگت لڑتی رہوں حتےٰ کہ ہرا دوں۔

ان بزاز صاحب کو خود تو جواب بن نہ پڑا۔ کاظم کی آڑ ڈھونڈھی بولے بھئی کاظم میاں یہ ابھی ابھی آپ کے آنے سے پہلے فرما رہی تھیں کہ ان کو کسی آہو چشم سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ ورنہ ساری چوکڑی بھول جاتے۔ وہ تو شمشیر عریاں تیار ہی رہتا تھا۔ بولا یہ وحشی سدا رم کر گیا رام نہ ہوا۔ میں بھی تلی بیٹھی تھی۔ بولی پالا پڑے تو پتہ چلے۔ جواب ملا۔ یہ روگ کبھی پالا نہیں میں نے کہا پالا چھوڑ کر بھاگ جائیے گا۔ اللہ رے دماغ۔ فقرے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ فوراً جواب دیا۔ کیا عرض کروں بہت سے گلرخوں پر اسی امید میں پالا پڑ گیا۔

دماغ نے ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ زبان بولنے سے رہ گئی عقل جواب دے گئی۔ حاضر جوابی رخصت لے گئی۔ میں لاجواب ہو کر رہ گئی۔

دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ یہ سب باتوں میں مصروف تھے۔ اِدھر اُدھر کے ذکر اذکار کرتے رہے۔ میں ایک طرف کسی از کار رفتہ لیڈر کی طرح بیٹھی تھی۔ کاظم نے میری جانب دیکھا اور کہا آپ کیوں چپ ہیں۔ اس مرتبہ اس کی پُر معنی آنکھوں میں پھر صلح کا پیغام تھا۔ میں نے جواب

دیا آپ کی باتیں سُن رہی ہوں۔ کہنے لگا ہم مردوں کی روکھی پھیکی باتوں میں آپ کو کیا مزا آئیگا۔ ایک اور بولے ہاں صاحب باتیں تو ان کی ہوتی ہیں چکنی چپڑی۔ روئے سخن میری طرف تھا، جواب دینا لازم، میں نے کہا کیوں روغنِ قاز مل رہے ہو۔

کاظم بولا۔ یقین جانیئے آپ سے مل کر بہت دِل خوش ہوا۔ میں نے ایسی حاضر جواب صاحبہ آج تک نہیں دیکھی تھیں۔

اتنے میں ایک نے کاظم سے پوچھا آج کل کیا کر رہے ہو۔ بولا لکھ رہا ہوں۔ ایک عادت سی ہو گئی ہے سینۂ قرطاس سیاہ کرتا ہی رہتا ہوں۔ میرا جذبۂ انتقام نہ مانا۔ فقرہ سوجھ گیا اور میں نے کہہ دیا۔ آخر یہ سیاہ کاری کس لئے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ محترمہ مہر سیاہی سے کام لیتی ہے تو نام چھوڑ جاتی ہے۔

مجھے جواب بن نہ پڑا۔

کاظم ایک غوط کی سی حالت میں دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا اس محویت سے کیا دیکھا جا رہا ہے۔ بغیر میری طرف دیکھے دریا پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ شکاری جال ڈالے بنسیاں لٹکائے کانٹے چھوڑے بیٹھے ہیں۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پھنسی ہوئی مچھلی اپنی دوسری بہنوں کے لئے لاسہ بن جاتی ہے ان کو پھنسانے کے کام آتی ہے۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ قابو شدہ مچھلی بے پروائی سے تھیلے میں ڈال دی جاتی ہے اور نئی پھانسنے کا اہتمام شروع ہو جاتا ہے۔

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آزمودہ کار چارہ کھا جاتی ہے۔ کانٹا بچا جاتی ہے۔ یہاں شکاری گرہ کا کھوتا ہے۔

میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مچھلی پانی میں رہتی ہے پھر بھی بدبودار حالانکہ پانی کا کام بدبو دور کرنا ہے۔ فطرت کی خرابی فطرت دور نہیں کرسکتی۔

ہم جو مچھلی کھا رہے ہیں اس میں بساند نہیں۔ عقل انسانی طبعی خرابیوں کو بھی دور کرسکتی ہے۔

میں یہ بام مچھلی[1] دیکھ رہا ہوں۔ بہاؤ کے خلاف جا رہی ہے۔ رفتارِ زمانہ سے ٹکرا رہی ہے۔ بیچ دریا میں اس کے لئے جگہ نہیں۔ ایک طرف پھینک دی گئی ہے۔ منجھدار کا شفاف روح پرور پانی اس کی قسمت کا نہیں۔ کنار آب گدلے میں پڑی ہے۔

اپنے سماج کے خلاف جا رہی ہے۔ برادری باہر کر دی گئی ہے۔ ابھرتی ہے دبا دی جاتی ہے۔ آگے بڑھتی ہے دھکیل دی جاتی ہے۔ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ حیات ایک مسلسل تصادم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی دنیا دو گز گندا پانی ہے۔ اسی حلقے میں گاہ آگے جاتی ہے گاہ پیچھے آتی ہے۔ لہریں مسلسل اور منظم ہیں۔ یہ تن تنہا، طاقت، استقامت نہیں رکھتی۔ ٹکرا ٹکرا کر مر جاتی ہے۔

---

[1] اسے انڈوان بھی کہتے ہیں۔

میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے منظر عام پر مجھے عریاں کر دیا گیا ہو۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اکس ریے (X, Ray) کے فوٹو میں اپنے جسم کے کیڑے دیکھ رہی ہوں۔ اس ماہر جراح نے سینہ شق کر کے میرا دل مجھے دکھا دیا تھا اور اس کے بدنما داغ ایک ایک کر کے گنوا رہا تھا۔

آج مجھے اپنے سامنے ایک اور زہرہ نظر آ رہی تھی۔ وہ گاہ مجھ میں سما جاتی گاہ سامنے جا کھڑی ہوتی۔ میری طبیعت اس سے نفور تھی۔ میں اس کا قریب آنا پسند نہ کرتی تھی لیکن بے بس تھی۔ وہ جب چاہتی مجھ میں پیوست ہو جاتی تھی۔ مجھے کاظم کی صورت بری لگ رہی تھی۔ مجھے یہ جادوگر برا لگ رہا تھا جس نے میرے ہم ذات کو میرے روبرو لا کھڑا کیا۔ مجھے دنیا کی ہر چیز بری لگ رہی تھی۔ شاید میں آج اپنے کو خود بری لگ رہی تھی۔

اب ہم سب اپنی موٹروں کی طرف چلے۔ کاظم خود ڈرائیو کر رہا تھا راستہ میں یہ جھگڑا تھا کہ میں کس موٹر میں بیٹھوں۔ اکثر نے کاظم کی کار تجویز کی۔ پر اس نے خود نہ کہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ درخواست کرے اور میں انکار کروں۔ میں اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اسے ٹھکرانا چاہتی تھی۔ رنج پہنچانا چاہتی تھی۔ جذبۂ انتقام نے مجھے اندھا کر رکھا تھا اور میں اس امید میں اس کی کار کے پاس جا کھڑی ہوئی کہ شاید وہ اپنے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولے اور میں انکار کردوں۔ لیکن یہ کاظم سے بعید تھا اس نے نہایت تپاک سے پیچھے کی سیٹ کا دروازہ کھولا اور جلد باز آنے والوں کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ اب ہر شخص اس موٹر میں بیٹھنے کی کوشش

کر رہا تھا اور وہ برخود غلط کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

میں چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح امید انتقام میں بل کھا رہی تھی موقع کی متلاشی وقت کی منتظر۔ احساسِ شکست سینہ میں ڈنک مار رہا تھا۔

میں زخم لگانے والے ہاتھ کے قریب رہنا چاہتی تھی تاکہ ڈسنے کا موقع ہاتھ سے نہ جائے۔ مجھے زہر انتقام چڑھ رہا تھا۔ مجھے کوئی طاقت کاظم کے قریب کھینچ رہی تھی۔

یقیناً یہ نفرت تھی جس کی کشش محبت سے سخت تر ہوتی ہے۔

میں کاظم کی سیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو سرکی میری اُنگلیاں اس کی پیٹھ کو چھوگئیں۔ وہ غیر محسوس طریقہ پر ذرا آگے کو ہو گیا جیسے میں کوڑھن تھی اور قابلِ نفرت۔

انگلیاں خزاں زدہ شاخوں کی طرح جھک کر رہ گئیں۔ ہاتھ کچھ اس طرح ناکام و شرمسار واپس آیا جیسے فلاکت زدہ بابو (No vacancy) سنکر یا کوئی بوالہوس میرے منہ سے نہیں سنکر۔

ایک صاحب نے گانے کی فرمائش کی میں نے انکار کیا۔ انھوں نے اصرار۔ سچ یہ ہے کہ اس درخواست نہ کرنے والے کی درخواست کا انتظار تھا۔

ایک اور جن کو اپنی موسیقی دانی پر بڑا ناز تھا اور مجھے اس راگ میں لانا چاہتے تھے۔ بولے ہم کو تو پکا گانا پسند ہے کوئی دھرپت ہو جائے۔ ایک خاکسار نے غزل کی فرمائش کی۔ کہنے لگے وہ ہاتھی چنگھاڑ سُر نوازی ہمیں ایک آنکھ اچھی نہیں لگتی۔ ان دونوں میں بحث ہونے لگی۔

میں نے کاظم کی کمر پر ہاتھ رکھا اور کہا، جناب ہمہ داں صاحب کا اس معاملہ

یں کیا خیال ہے بولا یہ ہیچمداں انصاف کی کہے گا۔ چونکہ خیر سے نور جہاں کا ہاتھ جہانگیر کی پشت پر رکھا ہے سب کی نگاہیں میرے ہاتھ پر تھیں اور وہ کچھ مفلوج سا ہو گیا تھا۔

کاظم اگر تجھ سے بدلہ نہ لیا تو میرا بھی نام زہرہ نہیں، جو رنڈی ہوں تو تجھے نیچا دکھا کر چھوڑوں گی۔ تو نے میرا ہاتھ جھٹکا ہے میں تیرا دستِ طلب ٹھکرا دوں گی۔

پکے کے شوقین دھن کے پورے بولے کیوں بھئی کاظم یہاں کیوں بند ہو گئے بتاؤ نہ۔ وھرپت خیال اچھا یا غزل ٹھمری، دادرا۔ کاظم نے جواب دیا۔ صاحب بات یہ ہے کہ جس طرح شعر کو الفاظ وزن اور معنی پہ تقسیم کیا جا سکتا ہے اسی طرح راگ کو سُر تال اور رس پہ سُر مترادف ہے۔ الفاظ کے تال، وزن کے ہم وزن اور رس معنی کے ہم معنی جس طرح بے معنی شعر دل و دماغ پر اثر نہیں کر سکتا بعینہ بے رس راگ جذبات پہ مضراب نہیں کرتا۔ دل و دماغ کو نہیں چھیڑ سکتا۔ اس دورِ انحطاط میں پکا گانا محض تال کی کاٹ کا نام ہے اور بس جس میں قطعاً کوئی لطف نہیں غزل میں کم از کم اتنی گنجائش ہے کہ اگر دھن مزا نہیں دیتی تو شعر کے معنی لطف دے جاتے ہیں۔

بات مدلّل تھی میں جواب دے نہ سکی۔ اپنے سب ہتھیار آزمانے چاہ رہی تھی۔ اب کی فرمائش پہ یہ غزل شروع کی :-

اس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہو گئی ۔۔۔ ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی
یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل ۔۔۔ یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہو گئی
کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور ۔۔۔ جس پر نثارِ ہستیِ پروانہ ہو گئی

صد شکر کچھ تو اُن سے ہوئی آج گفتگو — یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی
اللہ رے اشکباریِٔ شمعِ شبِ فراق — جو صبح ہوتے ہوتے اِک افسانہ ہو گئی
حیرت کے غمکدہ میں خوشی کا گذر کہاں — تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

کاظم پر عجیب کیفیت طاری تھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر شعر ایک جامِ شراب ہے جو اس مست کو مست تر بنا رہا ہے۔ غلافی آنکھوں پر خمار چھایا۔ خون چہرہ پر چڑھ آیا جھومتا تھا اور داد دیتا تھا۔ ایک ایک شعر دس دس دفعہ گوایا۔ ہر مرتبہ نئی ادا سے درخواست کرتا۔ مجھے اس کا ایک ایک فقرہ یاد ہے۔ ایک ایک جملہ یاد ہے۔ ایک ایک حرف یاد ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ ادا میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔

خرد مند لڑکھڑا رہا تھا۔ ہوشیار مست ہوا جا رہا تھا۔ ہاروت زہرہ کے جال میں آ رہا تھا۔ دامانِ زلیخا دستِ یوسفؑ کھینچ رہا تھا۔ موسیقار اپنا رنگ جما رہا تھا۔ سروں کی بارش میں پاک دامن تر دامنی کی طرف آ رہا تھا۔ مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش تھا۔ عقل کا پجاری حواس سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی ساقی گری پر ناز تھا۔ وہ آتشہ اور سہ آتشہ پلا رہی تھی۔ راگ راگنی کا مینہ برسا رہی تھی۔ زیر و بم سے توازن دماغی [illegible] دوبالا کر رہی تھی۔ مست تھی اور مست بنا رہی تھی۔ کاظم کو اپنا کمال دکھا رہی تھی۔ کاظم پر چھا رہی تھی کاظم کو نیچا دکھا رہی تھی۔ خمار کامیابی نے مست کر دیا اور میں مستانہ وار گاتی رہی۔

افسوس ہر چیز کی انتہا ہے۔ ہر نگاہ کے آگے حدِّ نگاہ ہے۔ ہم آبادی

میں سے ہو کر گذر رہے تھے۔ گانا بند کرنا پڑا۔

طلسم ٹوٹ گیا۔ نشہ اُتر گیا۔ امیدیں ڈھے گئیں۔ فرزانہ جو چندے عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا پھر اپنے مقام پر نظر آیا۔

ونڈ سکرین پر جو پیچھے کا ٹریفک دیکھنے کے لئے شیشہ لگا تھا اس میں ہم دونوں کی نگاہیں اکثر چار ہو جاتی تھیں۔ کبھی وہ نظریں بچا لیتا۔ کبھی میں۔ یہ آنکھ مچولی ہو رہی تھی کہ سب نے کاظم سے کچھ سنانے کو کہا۔ ظالم نے یہ شعر گایا ؎

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

میں ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھی تھی۔ کسان اپنے کام میں مصروف تھا
خودرو نباتات ایک طرف اکھیڑ کر ڈالتا جاتا۔ اس میں کام کے پودے بھی تھے ناکارہ بھی۔
لیکن کھیت گیہوں کا تھا اور یہ اس جنس کے نہ تھے۔ کھائے یہ بھی جائیں گے۔
پر انھیں صرف وحشی کھائیں گے۔

بیج ان کا بھی پڑا تھا۔ ان کے لئے بھی زمین کا سینہ شق ہوا تھا۔ دھرتی
ماتا کا لہو انھوں نے بھی پیا تھا۔ پر کیا کریں غلط جگہ اُگ آئے۔

بہت سی چڑیاں ایک چڑے کو مارتی ہوئی آئیں۔ سب کہہ اٹھے، بے ایمان نے
بدمعاشی کی ہوگی۔ انسان کا قانون حیوان سے مختلف ہے۔ یہاں چڑے
چڑیاں مل کر صرف چڑیا ہی کو مارتے ہیں۔

یہ پنچھی اڑ گئے۔ ایک اور جھرمٹ آیا۔ یہ سب ایک چڑیا کو مار رہے تھے
وہ رنگی ہوئی تھی۔ اس کے ہم جنس اسے مارے ڈالتے تھے۔ اس کا رنگ بدلا
ہوا تھا اور رنگنے والا ہاتھ کسی اور پر رنگ چڑھا رہا تھا۔

دنیا کا انصاف نرالا ہے۔ مال مسروقہ کو سزا دی جاتی ہے سارق
تلو بچ جاتا ہے۔

کسان کی گھر والی روٹی لے کر آئی۔ نیلے پیلے، بدرنگ پھٹے پرانے کپڑے

سانولا رنگ، بھدّا بھدّا نقشہ۔ مرد نے پانی کھینچا۔ عورت نے زمین جھاڑی۔ دونوں کنوئیں پہ کھانے ہو بیٹھے۔ موٹی موٹی روٹیاں، لگا دن میں پیاز اور گڑ سب گِنا چُنا۔ شاید پیٹ بھراؤ بھی نہیں۔ عورت گِنتی بھی چھوٹی اٹھاتی تھی اور ڈلی بھی۔ بڑی بڑی مرد کے آگے سرکاتی جاتی۔ مرد ان جذباتی حرکات سے بیخبر نوالے مار رہا تھا۔ کام کرنے پیدا ہوا ہے، اس نسوانی شاعری سے آشنا نہیں۔ نہ وہ فطری شاعرہ ہی داد طلب تھی۔ وہ بھی یہ سب کچھ نادانستہ طبعی طور پر کر رہی تھی ایثار اس کے خمیر میں تھا۔ عورت تھی۔

عورت میں بھی ہوں طینت وہی ہے۔ شاید خمیر غلط اٹھایا گیا ہے۔ جو۔ رزق ہے، ایک شکل میں حیات بخش۔ دوسری شکل میں خرمنِ خرد سوز کج رو کُبھڑی احول ہوس زدہ، عقل انسانی نے جَو سے بیّر (Beer) بنائی۔ انگور سے شیمپین (Chapaigne) عورت سے رنڈی۔

میں اس غوط میں بیٹھی تھی کہ ایک صاحب نے میری جانب اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ بیچاریاں ازدواجی زندگی سے محروم ہیں۔ ایک تیر سا لگا۔ پر میں کچھ نہ بولی۔ وہ خموش ہونے والے تھے نہیں کہنے لگے۔ خدا بخشے اکبر الہ آبادی خوب کہہ گیا ہے۔ ایک نے پوچھا کیا، بولے قصہ طلب شعر ہے۔ وہ ہوا یہ کہ بی گوہر کلکتہ والی پشاور جا رہی تھیں، جب الہ آباد کے اسٹیشن پہ پہنچیں تو اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ سامان اتروالو اور خود پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئیں۔ وہ غریب پریشان کہ آخر ماجرا کیا ہے لیکن ترِیا ہٹ اور پھر تریا بھی........ بہر کیف حکم حاکمہ مرگِ مفاجات۔ وہ اس خیرہ سر کی خودسری سے واقف تھا تعمیلِ حکم

کی۔ یہ بیگم ٹمٹم میں سوار ہو، اکبر الہ آبادی کے گھر جا دھمکیں سکرٹری نے اطلاع کی کہ گوہر کلکتہ والی ملنے آئی ہیں۔ بڑے میاں اپنے بڑھاپے پر نادم، بیٹھک میں تشریف لائے۔ یہ تڑاخ پڑاخ مقراض زبان بولی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج عمر بھر کی آرزو بر آئی۔ میں تو پشاور جا رہی تھی۔ پر الہ آباد کا نام سنتے ہی دل نہ مانا کہ شرفِ قدمبوسی حاصل کئے بغیر چلی جاؤں۔ آپ جانیں عورت دل کی لونڈی ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے آج جناب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ دن میری زندگی میں یادگار رہے گا۔

بڑے میاں نے بھی مناسب جواب دئے۔ چلتے ہوئے کہنے لگی ایک اور آرزو ہے اگر خاطر عاطر پر گراں نہ گذرے۔ پہلے تو حضرت گھبرائے پھر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا، اس نے کہا اگر اپنی قلم سے کچھ رقم فرما دیں تو حرزِ جاں بنا کر رکھوں۔ جناب نے یہ شعر لکھ لفافہ میں بند کر حوالہ کر دیا۔

کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

کان یہ سُن رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی اپنے مناظر پیش کر رہی تھی اور میں اس تماشہ میں غرق تھی۔ ایک عجیب لطف تھا عجیب کھٹک نرالی کاوش تھی۔ اچھوتی خراش سینہ میں بیٹھا بیٹھا ورد ہوتا تھا۔ میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسا بھوکا روٹی کے تصوّر میں۔ بانجھ اولاد کے خیال میں۔ اولاد ماں کے دھیان میں۔

سینہ میں ایک چیز تھی۔ جو کچھ مانگ رہی تھی۔ پہلو میں ایک خلا تھا

جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ میرا رُواں رُواں کسی چیز کا متلاشی تھا میرا ہر قطرۂ خون کسی کی تلاش میں رَواں۔ میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا۔

آج مجھ میں وہ عورت جاگ اُٹھی تھی، جو بیوی بننے پیدا ہوئی ہے۔ جو ماں بننے پیدا ہوئی ہے۔ جو اپنے کو قربان کرنے پیدا ہوئی ہے۔

آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دے کر سُلا دیا گیا تھا۔ آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب و ریا اور غلط فضا کے انبار میں دبا دیا گیا تھا۔

فطرت ماحول کے خول کو توڑ رہی تھی۔ رنڈی کا جامہ چاک کر کے عورت برآمد ہونے کو تھی۔ عورت جو کھونے کو پانا سمجھتی ہے۔ عورت جو اپنا خون چُھپا کر نسل انسانی کو پالتی ہے۔ عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے۔ عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔

میں آدمؑ و حوّا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی۔ میری روح قالب چھوڑ کر ان کے طواف میں مصروف تھی۔ میرا دل سینہ میں سے نکل کر ان کے پیردل پر لوٹ رہا تھا۔

آج میں فطرت ہی فطرت تھی۔ ماحول سے مُبرّا۔ فضا سے بالاتر۔ جسدِ خاکی سے آزاد۔

مرد آدھی روٹی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ عورت تو اتنی دیر سے چھوٹے چھوٹے نوالے اسی لئے کھا رہی تھی کہ اس کا کماؤ اس کا سرتاج اس کا سردار، اس کے

بچوں کا باپ۔ اس کا مرد زیادہ کھا لے۔ وہ زنانہ شاعری تھی یہ مردانہ نثر۔

ایک صاحب مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے بھئی زہرہ تعجب ہے عورت جیسی حیا پرور، اور عصمت فروشی پر مائل ہو جائے۔

سینہ میں ایک انی سی لگی۔ میں نے زخمی شیرنی کی طرح ان کی طرف دیکھا۔ لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

کاظم بپھرے ہوئے شیر کی مانند غرّایا اور بولا ہم کو کچھ کہنے کا منہ نہیں۔ ایمانداری سے دیکھو تو تماشبین مرد اور طوائف میں تفاوت نہیں۔ ہم کو اپنا زمانہ یاد ہے۔ جب ہم ہزار بارہ سو ڈنڈ پیلتے۔ تیس سیر کے پھاوڑے سے اکھاڑے کو دو تین پلٹیاں دیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ زور کرتے۔ دس پانچ کے سانس بھراتے پانچ سات کو دم پھراتے اور آخر کو اکھاڑے ہی میں دوڑ لگا کر پڑ جاتے۔ رانیں ستون بنی تھیں۔ پنڈلیاں سُتی ہوئی۔ بدن پہ تیاری۔ چہرہ سیپی سا بشانوں پر خربوزہ کی قاشیں رکھی معلوم ہوتی تھیں سینہ سل کی مانند جب شام کو انگرکھا پہن کر نکلتے تو دس بیس ہزار میں ایک نظر آتے۔ ہم پر نظریں پڑتی تھیں۔ جب محرّم اور رام لیلا کے موقع پر بھیڑ میں سے گزرتے تو لوگ خود راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں ہم اکثر مرکز نگاہ رہے۔ چھوٹی بڑی ستر ہویں پر لوگ ہمیں دیکھتے تھے سومنگ باتھس (Swimming baths) میں ہم نہانے نہیں بدن دکھانے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر کنارہ پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ بغل بچوں کی تیاری دیکھنے کے قابل تھی۔ سینہ اور کمر میں آٹھ انچ کا فرق۔

دن بھر سوتے شام کو بناؤ سنگار کر سیر کو نکل جاتے۔ تمام شب عالمِ رنگ و بو میں گزارتے۔ ہم میں اور رنڈی میں فرق نہ تھا۔ وہ بھی شب بیدار تھی، ہم بھی۔ اس کا بھی صبح کا وقت ریاض کا تھا، ہمارا بھی۔ شام کو وہ سولہ سنگار بارہ ابرن کئے سربام نظر آتی۔ ہم سر بازار۔ وہ بھی اپنے جسم کی سوداگر تھی ہم بھی۔ نقدِ حُسن کی دوکان اس نے بھی سجا رکھی تھی ہم نے بھی۔

فرق اتنا تھا کہ وہ اپنی جگہ بھاری تھی اور ہم اپنا خوانچہ دربدر لئے پھرتے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ معصیت اس کے پاس آتی تھی اور ہم معصیت کے پاس جاتے تھے۔ تفاوت اتنا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر پیٹ کی خاطر گناہ کرتی تھی اور ہم لذّتِ نفس کے لئے۔ وہ اس ماحول میں پیدا ہوئی تھی اور ہم شریفوں کی اولاد تھے۔ اس کا ظاہر باطن ایک تھا اور ہم گندم نما جو فروش۔ وہ اپنے امراض لئے (Isolatim Hospital) میں پڑی تھی اور ہم ان پہ اپنی شرافت کا پر۔ وہ ڈالے سوسائٹی کی فضا مسموم کر رہے تھے۔ وہ ایسا زہر تھی جسے سب زہر جانتے تھے۔ زہر ہم بھی تھے ولے شکر گونڈ۔ وہ ذلیل تھی اور ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ ذلیل ہم بھی تھے لیکن شرافت میں ملبوس۔

اُس سے شریف گریز کرتے تھے ہم شریفوں میں رستے بستے تھے۔ وہ بھیڑیا تھی بھیڑئے کے برن میں۔ بھیڑیا ہم بھی تھے مگر بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے۔ وہاں جال تھا جعل سازی نہ تھی۔ یہاں جال تھا دامِ تزویر کے ساتھ۔ وہ کوک شاستر تھی اور اس پر کوک شاستر لکھا تھا۔ کوک شاستر ہم بھی تھے لیکن ہم پر صرف شاستر کی چھاپ لگی تھی۔

The J. & K. University Library

ہم زہر تھے شہد میں ملے ہوئے۔ ہم کانٹا تھے پھولوں میں چھپے ہوئے ہم سانپ تھے سماج کی آستینوں میں۔ زہر کی شیشی وہ بھی تھی لیکن اس پر سُرخ لیبل لگا تھا۔ کانٹا وہ بھی تھی ولے پردہ ریجاں میں نہیں۔ سانپ وہ بھی تھی مگر مارِ آستین نہیں۔

میری آنکھیں بارِ احسان سے جھکی جاتی تھیں۔ دل کاظم کی طرف کھنچا جاتا تھا اور وہ ایک مقررانہ انداز میں آزمودہ کار وکیل کی طرح یکے بعد دیگرے دلائل دیتا جا رہا تھا محفل دم بخود تھی۔ کاظم کے مُنھ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ میرے دل و جان اس پر نثار ہو رہے تھے۔ ہر مثال بے مثال تھی۔ ہر دلیل ساطع۔ ہر برہان قاطع۔ ہر فقرہ ختم بیان معلوم ہوتا۔ ولے دوسرا اس سے اونچا جاتا منطق دست بستہ کھڑی تھی۔ زبان زنبیل لئے حاضر۔ حُسن بیان جلو میں۔ لغت حاشیہ بردار۔

اہلِ بزم اس کا مُنھ تک رہے تھے۔ میں نیچی نظریں کئے آئینہ دل میں دیکھ رہی تھی۔ گرانباری احسان سے نظریں نہ اُٹھتی تھیں۔

جن صاحب نے مجھ پر طنز کیا تھا وہ بولے۔ خیر سے وکالت ہو رہی ہے۔ کاظم نے کہا، نہیں حقیقت بیان کی جا رہی ہے۔ اگر عالمِ رنگ و بو کے دلدادہ مرد اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر دیکھیں حقیقت کو نظر انداز نہ کریں۔ سچ سے نہ کترائیں تعصب سے کام نہ لیں تو وہ اپنے کو رنڈیوں سے بدتر پائیں گے۔

وہ سانپ ہیں لپیٹوؤں کے کاٹنے پر معترض۔ وہ بھیڑیئے ہیں بھیڑوں کو راہِ راست بتانے پر آمادہ۔ وہ لومڑیاں ہیں بلّی کی چالاکی پر سرکہ جبیں۔

اگر ایمانداری سے دیکھیے اور ان غریبوں کی زندگی پر نظرِ غایت ڈالیے تو نظر آجائے گا کہ ان میں سے سو فی صدی ہماری نظرِ کرم کی مرہونِ منت ہیں۔ قابلِ تعزیر ہم ہیں وہ نہیں۔ ملامت ہم کو کرنی چاہیئے ان کو نہیں۔ لعنت ہم پر اترنی چاہیئے ان پر نہیں۔

وہ تو ہماری ہوس کا شکار ہیں۔ ہماری طبع کج رفتار کی نخچیر۔ ہماری خواہشات کی آلۂ کار۔

یہ زخم ہمارے لگائے ہوئے ہیں جن کو آج ہم وجہ عفونت کہہ رہے ہیں۔ یہ بیماری ہماری پھیلائی ہوئی ہے جس سے آج ہم الحذر کر رہے ہیں۔

یہ بس ہمارا بویا ہوا ہے جس کا پھل ان کو مل رہا ہے۔

جس آگ میں ان کے گھر پھک گئے وہ ہم نے ہاتھ تاپنے کو لگائی تھی۔

جس سیلاب میں ان کا سفینۂ حیات بہ گیا اس کے بند ہم نے ترنم آبشار سننے کو کھولے تھے۔

گناہگار ہم ہیں، خطاکار ہم، الزام ان کو دے رہے ہیں مطعون انھیں کر رہے ہیں۔

اُلٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
ناطاقتی کے طعنہ ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

اب دسترخوان بچھا۔ ٹفن باسکٹ کھلا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے۔ دسترخوانِ خوانِ فرعون معلوم ہوتا تھا۔ میں کوشش کر کے کاظم کے پاس بیٹھی۔ طشتریاں کم تھیں۔ میں نے اپنی رکابی کاظم کے سامنے سرکا دی

وہ کچھ مجبور سا ہو گیا اور میرے ساتھ کھانے لگا۔

ایک صاحب بولے، ماشاء اللہ ستّ کولے[1] کھائے جا رہے ہیں۔ کاظم نے سب کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔ یہ ڈومنیاں کیوں خموش بیٹھی ہیں ایک بولا دولہا بڈھا ہے۔ کاظم نے کہا آپ کو تجربہ ہو گا۔ اور کیوں بندہ نواز کھا ہم رہے ہیں۔ مرچیں آپ کے لگ رہی ہیں۔ کیا زخموں پر نمک چھڑکا جا رہا ہے۔ ماشاء اللہ بڑی گرم گرم باتیں بنا رہے ہو۔ یار ہو رکابی مذہب جہاں دیکھا توا پرات، وہیں گزاری ساری رات۔ میاں ملّا منش تم اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھو۔ دوسرے بولے مُردہ دوزخ میں جائے چاہے جنّت میں۔ تیسرے نے کہا دیکھتے رہو مُردہ جنّت ہی میں جائیگا۔

کاظم نے جواب دیا اپنے یار بہشت ارضی کے رضوان ٹھیرے تو اپنے گھرے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا ہم جانتے ہیں تم بڑے گھرے ہو۔ پر ذرا گھرے سے بچے رہنا۔ کاظم نے کہا ملّا جی چیرتے نکل جائیں گے۔

دوسرے نے جواب دیا بس زیادہ ملّاجیاں نہ اُڑائیے۔

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار ٭ کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

کاظم بولا آپ کنار سے محروم رہ گئے ہوں گے۔ اپنی اپنی قسمت ہے یہاں تو کنار بھی ہمارے لئے ہے کنارہ بھی۔

---

[1] یہ ایک رسم ہے جو نکاح کے بعد دولہن والوں کے ہاں ادا کی جاتی ہے۔ دولہن کے ہاتھوں پر مصری کی ڈلیاں چنی جاتی ہیں اور دولہا ان کو منہ سے اٹھاتا ہے۔ یہ رسم ڈومنیاں ادا کرواتی ہیں اور برابر گاتی جاتی ہیں۔

وہ چونکھی لڑنے والا جواب دینے میں مصروف تھا۔ کھانے سے بے خبر
مجھے ڈر تھا کہ یہ بانکا سپہتیا کہیں بھوکا نہ رہ جائے۔
اس خیال سے ایک کسک سی ہوتی تھی۔ یہ درد میں نے آج پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ شاید آج پہلی دفعہ میرے سینہ میں عورت کا دل دھڑک رہا تھا۔ دل نے دماغ کو احکامات دئیے۔ دماغ نے تدبیر نکالی۔ میں دستر خوان پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سب نے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا آپ لوگ مذاق کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں اُچھو ہو جائے گا۔ ہم باز آئے ایسے کھانے سے۔ مجھے اِصرار کر کے بٹھایا گیا۔ وعدہ کیا کہ اب مذاق بند۔ کھانے کے بعد دیکھا جائے گا۔
کسان اور کسان کی بیوی میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ اور میں غیر ارادی طور پر اچھی اچھی چیزیں کاظم کی جانب سرکانے لگی۔ لیکن اس افراط میں یہ ایثار محض تماشہ معلوم ہوتا تھا۔ شعر تھا جس میں معنی نہ تھے۔ جسم تھا جس میں روح نہ تھی۔ راگ تھا جس میں رس نہ تھا۔ کاش میں غریب ہوتی۔ کاش میں اس ڈرامہ کی سچی ہیروئن ہوتی۔ کاش میں اس لذّت سے محروم نہ کی جاتی۔
میں یُسر کو اس عُسر پر نثار کر دینے کو تیار تھی۔ تمام راحت اس کلفت کی نذر کر دینے کو حاضر۔ دولت اس غربت پر نچھاور کر دینے پر آمادہ۔ تمام سُکھ اس دُکھ پر تج دینے کو موجود تھی۔
عورت کی طینت زمین کی سی ہے۔ بوجھ اٹھانے میں راضی۔ خاکساری

ہیں خوش سینہ پہ پالنا اس کی خلقت۔ اپنی سوتوں سے آبِ حیات بخشنا اسکی عادت دُکھ میں سُکھ محسوس کرنا اس کی خصلت۔ قربانی اسکے خمیر میں۔ ایثار اسکے ضمیر میں۔

جب کسان کو ابرِ رحمت ترسائے۔ زمین اپنا سینہ شق کرکے پانی بہم پہنچائے مرد پر جب آفت آئے۔ عورت آغوشِ راحت لئے اس کے پاس پہنچ جائے۔ تھک کر مزدور زمین پہ آرام پائے۔ دُکھ درد سے مرد کو نجات عورت کے پہلو میں ملے۔ یہ اولوالعزم درماندہ ہو کر زمین پر سہارا لیتا ہے۔ یہ دنیا کو سر پر اٹھانے والا سرمایوس عورت کے سینہ پہ ٹکاتا ہے۔ مرکر انسان زمین میں ٹھکانا پاتا ہے تھک کر مرد عورت کے پاس سکون حاصل کرتا ہے۔

آخر کھانا ختم ہوا۔ دسترخوان بڑھایا گیا۔ کاظم مجھ سے دور جا بیٹھا میرا دل گھبرانے لگا۔ چندے یگانہ پھر بیگانہ نظر آیا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک فصل تھا۔ ایک خلیج تھی۔ ایک بُعد تھا جو عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب ہم واپس ہوئے۔ محفل درہم و برہم ہو گئی۔ ایک خواب تھا جو خوابِ بے تعبیر ہو کر رہ گیا۔

سڑک پر ایک تانگہ والے کو S.P.C.A کے انسپکٹر نے پکڑ لیا۔ گھوڑے کا سینہ زخمی تھا اور مالک اس سے کام لئے جارہا تھا۔ سینہ پر رگڑ لگتی۔ زخم بڑھتا جاتا۔ سماج اس کی حمایت پر آمادہ ہے۔ تانگہ والا بے رحم قرار دیا گیا۔ اس کا چالان کیا گیا۔

میری پڑوسن بیمار ہے۔ صحت خراب ہے۔ اسے تانگہ کے گھوڑے کی طرح چلایا جاتا ہے۔ صحت گر رہی ہے۔ زخم روز و شب ہرے ہو رہے ہیں۔ حیات اس سے دور ہوتی جاتی ہے ہاموت قریب، یہاں بے رحمی ہو رہی ہے اور بیر حمی والے نہیں آتے۔ سوسائٹی برائے انسدادِ مظالم بر حیوانات تو موجود ہے۔ سوسائٹی برائے انسدادِ مظالم بر انسان مفقود۔

انسان۔ انسان سے بے خبر جانور کی حفاظت کرتا ہے۔ بڑے بڑے مخیر۔ دیالو۔ ہمدردانِ قوم۔ سادھو۔ ساہوکار۔ گئو شالہ بناتے ہیں۔ رنڈ شالہ کوئی نہیں بناتا۔ یہی عبا و قبا والے۔ یہی پنڈت تلک دھاری۔ انسان کے دم پر بناتے ہیں جیوان کی حفاظت کا دم بھرتے ہیں۔

کل ہی ایک صاحب تشریف لائے۔ آنے کی پہلے سے اطلاع تھی۔ حکم تھا ایرا غیرا آنے نہ پائے۔ بالکل پرائیویٹ ملاقات ہو گی۔ نوکر چاکر گھر بد بسازندہ

چھٹی پر۔

بند موٹر دروازہ پر رُکی۔ ساتھیوں نے پنڈت جی مہاراج کو حلقہ میں لے لیا۔ کسی کی نظر پڑنے نہ پائی۔ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔ یہ رنڈی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھنے والے سماج کے پوتر سپوت وشیا کے گھر پدھارے۔ زہے نصیب۔

بھاگوان مجھ ابھاگن کے گھر آئے۔ میرے بھاگ کھل گئے۔ ساتھی نوٹوں کی گڈّیاں لائے تھے، شراب کی بوتلیں۔ سوڈے برف اور نقل کا انتظام یہاں پہلے سے تھا۔

ساغر گردش میں آیا۔

قوم کے دستگیر لڑکھڑانے لگے۔ ملّت کو خواب غفلت سے جگانے والے نے عقل و خرد کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ جذبۂ ملّی کا حامل مجذوب سا ہو گیا۔

برت کا عادی شبِ برات منا رہا تھا۔ قوم کی روح کو بیدار کرنے والا اسپرٹس سے شوق فرما رہا تھا۔ خضرِ ملل کالے[1] پانی میں غرق ہوا جا رہا تھا۔

ملک کے یتیموں کے لئے چندہ جمع کرنے والے ہاتھ ایک جنم کی رنڈیا پیدائشی یتیم کا دامن تھام رہے تھے۔ اناتھ آشرم قائم کرنے والے ایک وشیا کے ناتھ بنے تھے۔

ملک و ملّت کا بوجھ اٹھانے والے کندھے قوم کی ایک بھٹکی ہوئی لڑکی

---

[1] عورتیں شراب کو کالا پانی کہتی ہیں۔

کے سر کا بوجھ اٹھا رہے تھے۔
قوم کے لئے سایۂ رحمت طوائف کی زلفوں کے سایہ تلے آرام فرما رہے تھے۔
ملک کا سردار رنڈی کے سینہ پر سر رکھے پڑا تھا۔
وطن کے لئے آگ میں کود جانے والا آبِ آتش دار کا شکار تھا
برادرانِ ملت کے لئے خوں بہا دینے والا دختِ رز کا لہو پی رہا تھا۔ ملک کو اپنے آغوش میں لینے والا طوائف کے آغوش میں تھا۔
رام رام جپنے والے رم چڑھا گئے۔ ہری ہری کی مالا پھرانے والے لہسن پیاز کھا گئے۔ سری سری کے جپیا بکرے نوش فرما گئے۔
اب مجھے گانے کا حکم ہوا۔ مہنت جی کے جوڑی دار نے جوڑی سنبھالی۔ ایک رنگ رسیا سارنگی لے بیٹھے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

تن دھولا من میلا ہر دم پاپ میں دھیان
میں جانی کوئی سادھو ہوئیں نکلے کپٹ کی کان
بیا بمیکدہ وچہرہ ارغوانی کن مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند
تن دھولا من میلا
حافظا مے خور رندی کن وخوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را
تن دھولا من میلا

ایک صاحب جن کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا بولے یہ لفظ "دگر" نہیں

"دگر" ہے بالکسر نہیں بالفتح ہے۔ میں نے کہا بجا ارشاد ہوا۔ میری نظر سے بھی ایک نسخہ میں ایسا ہی گزرا تھا لیکن وہاں "رندی" کی دال پر بھی طوئے بنی تھی۔ دوسرے بولے زہرہ بائی ہماری بھی اس پر صاد ہے۔ یہ فقرہ تمہاری تیزیٔ طبع پر دال ہے۔

پہلے والے نے کہا صاحب یہ نسخہ کا کیا قصّہ ہے۔

میں بولی جناب یہ عطار کی دوکان ہے۔

فرمایا وہ کیونکر؟

میں نے کہا شربتِ وصل موجود۔ عناب لب مُہیّا۔ گلِ رخسار و قندِ سخن حاضر۔ ہاں شربتِ دینار کی کمی تھی سو جناب لے آئے۔

جام پر جام لُنڈھ رہا تھا۔ بوتلوں پر بوتلیں خالی ہو رہی تھیں۔ نشہ گٹھے تھے۔ رنگ جمے تھے۔ میں رنگِ روزگار دیکھ رہی تھی۔ نیرنگِ حیات کا مطالعہ کر رہی تھی۔

ایسے بہت سے پنڈت مولوی مُلّا آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ سُرخ رُو یہاں روسیاہی چاہتے ہیں۔ نیکوکار گناہ کی تلاش میں آتے ہیں۔ یہ حمام ہے حمام۔ یہاں قبائے ریا اتار دی جاتی ہے۔ ایک چھینٹے میں ماتھے کا تلک دُھل جاتا ہے۔ عُریاں حقیقت نظر آتی ہے۔

میں ان خیالات میں تھی۔ آنکھوں کے سامنے فانوسِ خیال کی طرح سینکڑوں بزرگانِ ملک و ملت کے مرقعے گذر گئے جو میرے پاس تلاشِ معصیت میں آئے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک ڈاڑھی مُنڈے کی

تصویر سامنے آئی۔ بچ کر نکلنے والا۔ کترا کر جانے والا۔ رند صورت، شیخ مشرب۔ یہ تصویر کاظم کی تھی اور میں اس میں محو کہ سامنے پٹری پہ یادش بخیر وہ خود جاتا نظر آیا۔

شیروانی کے بٹن کھلے تھے۔ لیکن دامن ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے مسیتا کو آواز دے کر کہا دیکھو سامنے کاظم صاحب جا رہے ہیں۔ ان سے کہو ضروری کام ہے ایک منٹ کے واسطے بلایا ہے۔

انسان کی رفتار، گفتار۔ چال، ڈھال۔ وضع قطع اس کی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔ کاظم کے بٹن کھلے تھے۔ لیکن دامن سمیٹے تھا۔ آزاد ہے و لے آلودہ دامنی سے گریزاں۔ فراخ دلی سے ملتا ہے۔ لیکن دامن بچا کر۔

میں کچھ ملگجے سے کپڑے پہنے پولی حیران ہی سر جھاڑ، منھ پھاڑ بیٹھی تھی، فطرتاً آئینہ کے سامنے کھڑی ہو بالوں کو درست کرنے لگی۔ آس اور یاس نقشہ جما رہی تھیں۔ ایک دل کہتا تھا آئیں گے۔ ایک دل کہتا تھا ناممکن۔ اَن ہونی بات ہے۔ شریف، عزّت دار، تعلیم یافتہ انسان شہر میں ایک دو نہیں لاکھوں اس کے جاننے والے۔ دن دہاڑے کھلے بندوں دیس کے دیکھتے رنڈی کے کوٹھے پہ ہرگز قدم نہیں رکھ سکتا۔

سیڑھیوں پہ پیروں کی آہٹ ہوئی۔ مسیتا کی چال میں پہچانتی ہوں۔ وہ بھی تھا لیکن آگے کوئی اور۔ آنکھیں دروازہ کی طرف تھیں کہ وہ آ گئے۔

میں نے مسیتا سے کہا کنڈی لگا دے۔ فرمایا کیا حبس بیجا کا ارادہ ہے۔

میں نے کہا جی ہاں۔

بولے یہ جرم ہے۔ میں نے جواب دیا ہم جرائم پیشہ۔
وہ ایک طرف کو ہو بیٹھے۔ میں نے کہا تکیہ سے لگ جائیے۔ فرمایا
خدا پر تکیہ کرتا ہوں۔
میں نے کہا یہ بھی فقیر کا تکیہ ہے۔
جواب ملا، امیروں کے لئے وقف۔
میں نے کہا۔ اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ۔
بولے۔ متولی تو کوئی نہ کوئی ہونا ہی چاہیئے۔
پھر کہا ماشاءاللہ اب تو آپ خوب حاضر جواب ہوتی جاتی ہیں۔
میں نے کہا جی ہاں ضلع جگت کی مشق کر رہی ہوں۔ آپ سے
میچ ہو گا۔
جواب دیا میں آپ کا میچ نہیں ہوں۔
میں نے کہا دیا سلائی دکھا کر دور کھڑے ہو گئے۔
بولا دیا جل رہا ہے۔ سلائی جل چکی۔ اتنا ہی وہ جل رہا ہے جتنا
جس میں تیل ہے۔
میں نے کہا، ایک فرق ہے۔
بولے۔ وہ کیا؟
میں نے کہا، ایک گھر میں جل رہا ہے ایک سرِ راہ۔ ایک آغوشِ فانوس
میں، ایک بادِ مخالف کے رحم پر۔ ایک طاقِ مسجد میں ہے دوسرا درِ میخانہ
پر۔ ایک شمعِ حرم ہے، ایک شمعِ مزار۔ ایک شمعِ ہدایت، ایک معصیت کی لو۔

ایک حجلۂ عروسی میں جل رہی ہے، ایک رنڈی کے کوٹھے پر۔

کاظم مسکرایا اور بولا۔ "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"۔ لیکن صرف سحر ہونے تک۔ اور سحر نام ہے اس سحر کے ٹوٹ جانے کا جو صدق اور کذب میں فرق نہ ہونے دے۔ سحر نام ہے اس اندھیرے کے پھٹ جانے کا جو راہِ راست اور کج میں امتیاز نہ ہونے دے۔ سحر نام ہے روشنی کا تیرگی پر فتح پانے کا۔ سحر تعبیر ہے خوابِ گراں کے اختتام سے۔ سحر مترادف ہے ردائے تیرگی کے چاک ہونے کے۔ سحر ہم معنی ہے سوتوں کے جاگ اٹھنے کے۔ سحر ہم معنی ہے آنکھ کھل جانے کے۔ سحر ہم معنی ہے روشنی نظر آجانے کے۔

میں نے کہا روشنی نظر آتی ہے۔ پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

بولا۔ وہ صبح کاذب ہے۔ صادق نہیں۔

کھول کر کچھ نہ کہتا تھا اور سب کچھ جتا رہا تھا۔ واعظ نہ تھا ولے صراطِ مستقیم دکھا رہا تھا۔ وہ عجمی زنار بند نہ تھا، پر جہنم کی پاپن کو پاپ سے بچا رہا تھا۔

ڈاڑھی مُنڈا تھا ڈاڑھی والوں سے بہتر۔ دُنیا دار تھا، گوشہ نشینوں سے ارفع۔

رونقِ بزم تھا، زینتِ ممبر نہیں۔ آرائشِ محفل تھا زیبائشِ خانقاہ نہیں آلودۂ روزگار تھا، دنیا سے دامن کشیدہ نہیں۔ ہم صفیرِ خاکیاں تھا ہمنوائے قدسیاں نہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ انسان تھا اور مکمل انسان سماج کی آنکھ کی پتلی۔

سوسائٹی کا مردِ نک چشم۔ معاشرہ کا انسان العین۔

یہ کاظم تھا کاظم، جو میرے بُلائے سے آگیا تھا جس نے میری بات نہیں ٹالی۔ جس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

دل اس کی طرف کھچا جا رہا تھا۔ جسم دل کا غلام ہے۔ یہ بھی قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کسی نہ کسی بہانہ اس کے پاس سرکتی جاتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ سمجھ رہا ہے پر جان کر انجان بن رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں اندھی ہو رہی تھی۔ دل کی بات کہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ کاظم اکیلا ہاتھ لگا تھا۔ ہاتھ سے جانے نہ دوں گی۔

شرم و حیا۔ رنڈی کو ان سے کیا واسطہ؟

حجاب و عار۔ طوائف کو ان سے کیا سروکار؟

اکثر کرم فرما، جفر۔ رمل۔ نجوم کے ماہر بن بیٹھتے ہیں۔ اسی بہانہ میری دستگیری فرماتے ہیں۔ یہی تدبیر سمجھ میں آئی۔

میں نے کہا کاظم صاحب مجھے ہاتھ دیکھنے میں بڑی دسترس ہے۔

بولا۔ یہ علم آپ کے ہاتھ کیسے آیا؟

میں نے کہا۔ ایک بڑے ماہرِ فن نے سکھایا ہے۔

فرمایا، یہ استادی فن ہم پہ آزمایا جا رہا ہے۔

میں نے کہا۔ مرد ہو کر ڈرتے ہو۔

بولا، جی نہیں مرد ہو کر عورت کو ہاتھ دکھانا شانِ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا اس شان وشکوہ سے ہمیں شکوہ ہے۔
وہ گریز کر رہا تھا۔ میں نے عرضِ مدّعا کا قصد کر لیا تھا۔ یہ تو تشبیب تھی۔ دستِ طلب دراز کر ہاتھ پکڑ لیا۔

گورا گورا ہاتھ، گہری گہری لکیریں۔ ہتھیلی اور انگلیاں متناسب۔
مدھم سے گٹوں کے نشان ورزش کی خبر دے رہے تھے۔

اس ہاتھ پر میری نظریں جم کر رہ گئیں۔ اس نے بھی احتجاج نہ کیا۔ میں بھی دیکھتی رہی۔

لکیروں نے شکلیں اختیار کیں۔ ہتھیلی پر وہ رسمیں بن گئی مجھے اس پر کاظم کی صورت نظر آنے لگی۔ کبھی اکھاڑے میں پھاوڑہ لئے نظر آیا۔ دلوں پہ ضرب کاری لگانے والا زمین گود رہا تھا۔ پھاوڑا چھوڑ قلم لے بیٹھا۔ مریخِ فلک عطارد بن گیا۔ ابھی لنگر لنگوٹا کسے اکھاڑے میں زور کر رہا ہے۔ ابھی میز کرسی پہ بیٹھا زورِ قلم دکھا رہا ہے۔

ابھی مٹی میں لت پت پسینہ میں شرابور کھڑا ہے۔ خلیفہ سیپی سے پسینہ سونت رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے غواض قلزمِ ادب دُر ہائے معنی لاتا نظر آیا۔

مٹی میں سنا ہوا ابھی گدڑیوں میں لعل معلوم ہوتا ہے۔ میز پر بیٹھا ہوا ابھی یکتائے روزگار۔

بدن پر اکھاڑے کی مٹی جمی ہے۔ پسینہ نے اس جامۂ خاکی کو جگہ جگہ سے چاک کر دیا ہے۔ کاظم کے سینہ پر سے دریا بہتے نظر آتے ہیں میرا

ان میں غرق ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔ سینہ کی سوتیں کھل گئی ہیں ایک دوسرے سے ملنا چاہتی ہیں۔

دل میں ایک لہر اُٹھی ہے۔ یہ دریائے محبت کے بھٹکے ہوئے قطرے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا چاہتے ہیں۔ قطرہ دونوں ہیں۔

لیکن ایک شراب کا ہے۔ ایک پانی کا۔ ایک گندا ہے اور ایک پاک کرنے والا۔

قطرہ دونوں ہیں۔ لیکن ایک آتشِ سیال ہے دوسرا آبِ زلال۔ ایک آگ لگانے والا ہے دوسرا بجھانے والا۔ ایک وجہ ممات ہے دوسرا سببِ حیات۔

یہ مل نہیں سکتے ان کو ملانا گناہ ہے۔

گناہ۔ گناہ کرنے کو تو میں پیدا ہوئی ہوں معصیت میرے خمیر میں ہے۔ نہ صرف میرے خمیر میں بلکہ بنی نوع انسان کے خمیر میں۔

میں بھی انسان ہوں اور انسانوں سے جُدا نہیں کی جا سکتی ہیں۔ [illegible] سماج میں رہنے کی حقدار ہوں۔ یہاں سے نکالی نہیں جا سکتی۔

قطرہ ہوں دریا کا جزو لاینفک۔ گدلا ہوں۔ آلودہ ہوں۔ لیکن دریا [illegible] ہے شفاف اور گدلے پانی کے اشتراک کا۔ دریا مشتمل ہے منزہ اور مکدر پانی پر۔

گدلا نکال دیجئے۔ ستھرا ہوا رہنے دیجئے۔ قربِ خاک پھر ایک [illegible] کو خاک آلودہ بنا دے گا۔ یہ سعی لاحاصل دریا کو خشک کر دے گی۔

لیکن پانی کو صاف نہ کر سکے گی۔

مانا کہ میں شراب ہوں۔ لیکن میرا جزوِ اعظم پانی ہے۔ میری حقیقت پانی ہے۔ مجاز حقیقت کو نہیں چھڑا سکتا۔ شاخیں جڑ سے دور نہیں کی جاسکتیں۔ فروعات اصل کو نہیں چھوڑ سکتیں۔

کاظم بھی قلزمِ حیات کا ایک قطرہ ہے۔ اور میں بھی۔ یہ دونوں ملنے کے حقدار ہیں اور ملیں گے۔

تمازتِ آفتاب پانی کو بھاپ بنا کر اُڑا لے جاتی ہے۔ آبِ مُصفّا پھر برس جاتا ہے۔ آبِ حیات بخش بنتا ہے۔ دریا سے ہم آغوش ہوتا ہے۔

آفتابِ محبّت ہر گندگی کو پاک کر دیتا ہے۔ ہر کدورت کو صاف کیا مجھے کاظم سے محبّت ہے۔ اس خیال کے ساتھ کچھ دھندلکا سا چھا گیا۔ کاظم اپنی ہتھیلی پر مسکراتا نظر آیا۔ صداقت پرست ہونٹ قسمت کی لکیروں سے جا ملے۔

سوچا تھا دل میں اَب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

فقیر کو جس در سے دھتکار دیا جاتا ہے وہاں پھر نہیں جاتا۔ منگتا کو جہاں بھیک نہیں ملتی وہاں وقت نہیں گنواتا۔ سائل جہاں سے بے نیل مرام آتا ہے اُدھر کا رُخ نہیں کرتا۔ درویش جس دروازہ سے تہی دست آتا ہے اس کو پھر نہیں کھٹکھٹاتا۔

میں دھتکاری گئی۔ ٹھکرائی گئی۔ تہی دست لوٹی۔ کوئی امید بر نہیں آئی۔ کوئی صورت نظر نہیں آئی پھر بھی۔

ہر دَم اسی کی دُھن ہے اسی کا خیال ہے
چھوٹے چھٹائے ربط پہ اب تک یہ حال ہے

گرگٹ کو سورج سے کچھ نہیں ملتا۔ لیکن گھورے جاتا ہے۔ لوہے کو مقناطیس سے کچھ حاصل نہیں لیکن اس کی جانب کھچا جاتا ہے۔ سوئی ایک جست میں جا چمٹتی ہے۔ بوجھل سینہ کے بل جاتا ہے، پر جاتا ہے۔

فطرت اپنا کام کرتی رہتی ہے عقل کی عقل دنگ ہے۔

کاظم نے میری اہانت کی۔ کاظم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

آہستہ سے کھینچا۔ شرافت سے کھینچا، مگر کھینچا۔ وہ خود بھی مجھ سے کشیدہ سا ہو گیا۔ الگ ہو بیٹھا۔ اُٹھ کر چلا گیا۔

میں نہ ذلّت کی عادی نہ توہین کی خوگر۔ اکثر بن مانگے پاتی ہوں۔ ورنہ جو مانگتی ہوں وہ پاتی ہوں۔ میں ہاتھ جھٹکتی ہوں۔ میرا دستِ طلب رَد نہیں کیا جاتا۔ میں انکار کرتی ہوں۔ انکار سنتی نہیں۔

مرد میرا کھلونا ہیں میں ان کے لئے لعبت چینی نہیں۔ مرد میرے نزدیک کٹھ پتلی ہیں۔ میں مٹی کی مُورت نہیں۔

میں مقناطیس ہوں، وہ سوئی۔ میں ناگن ہوں۔ وہ بھنگے بیک نظر میری طرف کھچ آتے ہیں۔ تلملاتے ہیں پر آتے ہیں۔

کاظم نے سانپن کی دُم پر پاؤں رکھا ہے اسے زہر کے گھونٹ پینے پڑیں گے۔

ہز ہائنس فربہ اندام کے ہاں دعوت ہے۔ تریا چلتر چل گیا۔ آج وہ شاطر میری زد میں آئے گا۔ کشتِ امید پہ پانی پھیرنے والے سے آج پانی ہو گا اور بھری محفل میں ہو گا۔

کاظم آیا۔ میں نے اس کی طرف رُخ نہ کیا۔ وہ بھی دوستوں کے اعراب میں آ گیا۔ شاہِ بزم پیادوں کی آڑ لے رہا ہے۔ فرس اپنی بساط سے آگے بڑھتا معلوم ہوتا ہے۔ بازی بگڑتی نظر آتی ہے۔ نقشہ الٹتا دکھائی دیتا ہے۔

ہم سب کھانے کے کمرے میں گئے۔

میں کاظم کے مقابل ہو بیٹھی۔ سب چُپ ہیں وہ بھی خموش۔ میرے سینہ

میں قلزمِ گفتار موجزن ہے۔ لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی۔ خیالات آتے ہیں الفاظ نہیں ملتے۔ فقرہ سوجھتا ہے زبان نہیں اُلٹتی۔ منتظر ہوں کہ وہ کچھ بولے تو ایسا مُنہ توڑ جواب دوں کہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ جائے۔ لیکن اس نے آج بولنے کی قسم کھائی ہے۔ مُنہ میں گھونگنیاں بھرے چُپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھا ہے۔

مجھ سے نہیں رہا گیا۔ اس کی خموشی تیز و تند فقروں سے زیادہ گراں گزر رہی تھی مُنہ سے نکل گیا۔ آج یہ بلبل کیوں خموش ہے۔

اس نے مجھ پر نگہٗ غلط انداز ڈالی مسکرایا اور کچھ نہ بولا۔

سب پی رہے تھے۔ وہ احتراز کر رہا تھا۔ میں نے کہا مرد ہیں وہ مئے مرد افگن سے ڈرتے ہیں اور خیر سے آج تو دریں چہ شک والا طوطی سبق بھولا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نہ خود یہاں ہیں نہ دماغ حاضر۔

میری جانب ایک خاص ادا سے دیکھا اور مسکرا کر بولا بندہ نواز یہیں بھی یہیں ہوں اور بفضلہ دماغ بھی حاضر ہے۔ نیز یہ وہ سبق ہے جو بھولے سے سوا یاد رہے، دختِ رز سے نہیں ڈرتا عقل و خرد کھونا خلافِ خردمندی تصوّر کرتا ہوں۔ یہ جواب ہے آپ کے آخری فقرہ کا، اور بلبل والے فقرہ کی بابت یہ عرض ہے کہ عندلیب مسلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر نہیں چہکتا۔

میں نے کہا خیر سے روزِ گلِ نورس درکار ہے۔

فرمایا نورس نہ سہی تاہم محرمِ رس بھی تو نہ ہو۔ ایسے گل کا کیا لینا

جو گلگونۂ رُخ کے لئے محتاج غازہ ہو۔

میں نے کہا وہ بلبل۔ بلبل کہلانے کا مستحق نہیں جو پھولوں میں انتخاب کرے اور وہ عندلیب ننگِ عنادل ہے جو گلوں میں امتیاز کرے۔

بولا گل بلبل کا گل ہے۔ جب تک صحنِ گلشن میں ہے۔ دستِ گلچیں و سبدِ گلفروش میں آیا، پرایا ہوا۔ بلبل اس سے کنارہ کرتا ہے۔

میں نے کہا۔ گلزار سے گل خود نہیں آتا لایا جاتا ہے۔

ایک اور بولے۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آئے

میں نے کہا اس کو یوں پڑھیئے۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ مرد
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آئے

کاظم نے میری جانب بنظرِ تحسین و آفرین دیکھا اور کہا ماشاءاللہ خوب جواب دیا جیتی رہو۔

میں نے کہا۔ جناب نے کچھ اس طرح دُعا دی کہ مجھے اپنے بڑے یاد آگئے۔

بولا۔ آپ بھی تو بڑی سعادت مند ہیں۔ بڑوں کی دست بوس ہوتی ہیں۔

میرے ایک برچھی سی لگی۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ نیچی آنکھیں کئے

کھانا کھا رہا تھا اور میں خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔
میز کے دوسرے سرے سے ایک صاحب بولے آج آپ کاظم سے ناراض معلوم ہوتی ہیں۔
میں نے کہا کیا عرض کروں میں گندم نما جو فروشوں سے پرہیز کرتی ہوں۔
وہ دبی زبان سے بولا۔ اَلنَّاسُ یُقِیسُ عَلیٰ نَفسِہٖ
میں نے کہا۔ ماشاء اللہ عربی میں بات کرتے ہیں۔ یہ عربی میاں ابھی اگاڑی پچھاڑی تڑا کر آئے ہیں، میاں الل بچھیرے۔ پڑوسی ہوشیار رہیں۔ کہیں سرکار دُلتی نہ جھاڑ دیں۔ ابھی تو بڑا اترا ہے ذرا مُنہ زوری کرتے ہیں۔
اسے مخاطب کرکے میں نے کہا۔ دہن کیوں نہیں وا کرتے کیا دہانہ سخت ہے۔
ایک صاحب بولے۔ بھئی کاظم اب تو یہ تم پر چھا گئیں۔
بولا۔ کیا عرض کروں، جس ضلع میں یہ گفتگو فرما رہی ہیں وہ انکا میراثی[1] حصہ ہے۔ خیر سے ساز کا ذکر فرما رہی ہیں اور ساز[2] سے ان کا شب و روز کا ساز باز ہے۔ سارنگی ان کا رنگ جمائے۔ جوڑی ان کی جوڑی دار۔ تنبورہ پر یہ تکیہ کریں۔ اور اسی پر ان کی آس۔

---

[1] میراثی کے معنی سازندہ کے بھی ہیں۔

[2] گھوڑے کا بھی ہوتا ہے۔ نیز باجوں کو بھی کہتے ہیں۔

میں نے کہا بھاگتے کیوں ہو اسی میدان میں رہو۔

بولا۔ آپ تو تھان کی رّڈی ہیں۔

میں نے کہا آپ کسی تھان پر بندھے ہی نہیں۔

بولا کوئی باندھنے والا نہ ملا۔

میں نے کہا۔ ہر فرعونے راموسیٰ۔

بولا۔ کوہِ طور پر چلّا کھینچئے۔ پھر بھی اللہ نے چاہا تو لن ترانی ہی کی صدا کانوں میں آئے گی۔

میں نے کہا تجلّی دیکھنے کو چشم دیدہ ور درکار ہے۔ کانوں[1] کا کام نہیں۔

فرمایا۔ ماشاء اللہ گو ہر شب چراغ بنی ہو۔

میں نے جواب دیا۔ بوم خصال کو چراغ سے کیا کام۔

کہا سچ ہے۔ تمام شب[2] بیدار اسی قبیل کے ہوتے ہیں۔

یہ مجھ پر چوٹ تھی۔ میرے فرقہ پر چوٹ تھی۔ میں بلبلا اُٹھی۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں جانے دو۔ یہ چشم چوٹ اچھی نہیں۔ میری چوٹ نہیں سہار سکو گی۔ مفت میں چوٹ کھاؤ گی۔

کاظم میں بدلہ لیتی ہوں۔ پلٹ کر کاٹتی ہوں۔ گرتے ہوئے بھی ایک ہاتھ مارتی ہوں۔ تو پچھتائے گا اور آج ہی پچھتائے گا۔ ذلیل کیا جائیگا اور آج ہی ذلیل کیا جائے گا۔

---

[1] بمعنی یک چشم۔ نیز معدن جہاں سے جواہرات نکلیں۔

[2] رنڈی راتوں کو جاگتی ہے اور اُلّو بھی۔

یہ رات زہرہ کی ہے اور آج زہرہ تجھے مات دے گی۔ کھانا ختم ہوا گانا شروع۔

سازندوں نے ساز ملائے مطرب نے آواز۔ پہلے اختر نے باگیسری کا خیال شروع کیا۔ پھر ایک آدھ غزل گائی۔ اب چہ می گوئیاں شروع ہوئیں۔ ساتھیوں نے کاظم سے کہا۔ ہز ہائی نس کا گانا سنواؤ۔ یہ اس بزم میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ پہلے تو ٹالتا رہا۔ جب نہ چلی اور احباب کا اصرار زیادہ ہوا تو سرکار سے مؤدبانہ عرض کی کہ اگر حضور کچھ تبرکاً و تیمناً عطا فرمائیں تو کرم ہوگا۔ ہم سب یہی امید لے کر آئے تھے۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ ہز ہائی نس کو تو موسیقی کا دورہ پڑتا تھا۔ جب سے سارنگی کے تاروں سے گز ہم آغوش ہوا تھا اور طبلہ پہ تھاپ پڑی تھی ان کا گلا سلسلا رہا تھا۔ قدرے مصنوعی انکار کے بعد راضی ہوگئے۔

خاص سازندوں کی طلبی ہوئی۔ یہ مضغۂ گوشت ذرا سنبھل کر بیٹھا حقیقت یہ ہے کہ بنانے والوں نے انہیں راگ پہ چڑھا دیا۔ تان سین بنا دیا۔ ورنہ سرگم سے بھی واقف نہیں۔ آواز اکرہ الصوۃ کے مترادف۔ گدھا ملہار الاپتے ہیں۔ سروں کا قتل عام ہوتا ہے۔ موسیقی کا خون۔ یاروں کے گھرے ہیں۔ اسے اُلو بناتے اور اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ ایک کی جیب خالی ہوتی ہے ایک کی بھرتی ہے۔ یہ اژدہا رعایا کا لہو چوستا ہے۔ اسے بھی جونکیں چمٹی ہوئی ہیں۔ اُدھر سے آتا ہے اِدھر سے جاتا ہے۔

دولت چکر میں ہے اور دنیا اس کے چکر میں۔ خود بھی گردش زدہ ہے اور دوسروں کو بھی ناچ نچا رہی ہے۔ ٹکتی کہیں نہیں چھلاوا ہے جھلک دکھاتی ہے چلی جاتی ہے۔ آج اس کے پاس کل اس کے پاس۔ رنڈی ہے بیوی نہیں۔ اسی لئے عزیز ہے۔

محفل میں ایک حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ دسمبر کا مہینہ۔ چلّے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ ململ کا کرتہ تن زیب کا انگرکھا زیب تن کئے زینت دہِ محفل ہیں۔ مزید برآں سامنے برف کے پانی کا جگ بھرا رکھا ہے۔ گاہے گاہے شوق فرماتے جاتے ہیں۔ حدّت کی شدّت۔ گرمی کا زور۔ کشتوں کی آگ برف سے بجھائی جا رہی ہے۔

دوسرے صاحب جب سے تشریف لائے ہیں ایک خاص ادا سے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کی تصویر کھنچ رہی ہے اور یہ ان کا بہترین زاویہ ہے اور حسین ترین پوز (Pose)

تیسرے عینک سے کھیل رہے ہیں۔ ہر پانچ منٹ کے بعد غریب کی پیشی ہوتی ہے۔ صاف کی جاتی ہے اور پھر تر۔ بینی پر متمکن کر لیجاتی ہے۔

چوتھے نے منہ اُگالدان بنا لیا ہے۔ پان پر پان چبائے جاتے ہیں۔ ماتھے پر سے پسینہ بہہ رہا ہے۔ رومال سے پونچھ لیتے ہیں اور پھر گلوری منہ میں۔ کوشش یہ ہے کہ محفل میں کم از کم ہر عورت یہ دیکھ لے کہ اس سردی میں انہیں پسینہ آ رہا ہے۔

چہرے مہرے کے بھی خاصے ہیں۔ کپڑے بھی سلیقے سے پہن رکھے ہیں۔

مجھ سے نہ رہا گیا، کہہ ہی اُٹھی۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را

اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

اختر کا، ان کا کچھ واسطہ بھی تھا، دوہری چوٹ پڑی۔ اُدھر

وہ جھیپی اِدھر یہ۔

بولے۔ گرمی لگ رہی ہے۔

میں نے کہا۔ صاحب تعجب ہے ہم تو ٹھٹھرے جارہے ہیں اور آپ کو

ماشاء اللہ پسینے آرہے ہیں۔

فرمایا۔ ہمارا فورن بلڈ ہے (Foreign Blood)۔

میں نے انجان بن کر کہا۔ کنیز مطلب نہیں سمجھی۔

ارشاد ہوا۔ ہم ہندوستانی نہیں ہیں۔ اصل میں ہم تازی ہیں۔

میں نے کہا۔ اختر! ہمارے دیس کی خوش طالعی ہے کہ ماشاء اللہ

آپ جیسے تازہ بتازہ تازی دیسیوں[۲] سے شوق فرماتے ہیں۔

اختر دانت پیس کر رہ گئی۔ وہ مسکرا کر چُپ ہو گئے۔

مزا اسی میں ہے کہ دوسرا بے مزا ہو۔

میں نے ان تازی النسل سے کہا۔ جناب اپنے وطن سے کب

تشریف لائے۔

فرمایا۔ ہمارے اجداد آئے تھے۔

---

[۱] تازی کتے کے لئے آتا ہے۔ [۲] دیسی، گھٹیا کتے کو کہتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ کتنا عرصہ ہوا۔

کہا کوئی دوسو برس۔

میں نے عرض کی، ماشاء اللہ آپ نے اپنی اصل کو خوب قائم رکھا کہیں پیوند لگنے ہی نہ دیا۔

بولے۔ جی ہاں ہمارے خاندان میں احتیاط برتی جاتی ہے۔

میں نے کہا۔ وہ تو ظاہر ہے۔ جب تو اب تک چشم بد دور یہ حال ہے لیکن اگر یہی گرما گرمی رہی تو کہیں خون پسینہ نہ ہو جائے۔

کاظم ڈریس سوٹ پہنے اس گروہ میں آگے کو ایسا بیٹھا تھا جیسے سازندوں میں رنڈی۔

میں نے کہا۔ خیر سے بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل معلوم ہو رہے ہو۔

بولا۔ آپ ناحق نیت خراب کرتی ہیں جناب کی قسمت کی ایک بوند نہیں۔

اچھا کاظم کہہ لے سُنار کے سو لوہار کا ایک۔ آج تجھے پانی پانی نہ کیا تو میں بھی رنڈی نہیں۔ ابھی رات باقی ہے اور رات زہرہ کی ہے۔

ساز مل گئے۔ سرکار نے گانا شروع کیا۔ محفل ہمہ تن گوش ہو گئی۔ ہمالیہ کی چوٹی پر سے پتھر لڑھکتے معلوم ہوتے تھے۔ عجیب ہیبت ناک سُر نکل رہے تھے۔ راگ سر پھوڑ رہے تھے۔ موسیقی چیختی چلاتی پھر رہی تھی محفل میں ستائش کا غلغلہ بلند تھا۔ ہر چنگھاڑ کے ساتھ داد کی آوازیں بلند ہوتیں اور ہر دہاڑ کے ساتھ نعرۂ آفریں۔

نعرہ زنیں کرتے کرتے اہلِ محفل کے گلے بیٹھ گئے اور سرکار کا گلا ابھی کھلا بھی

نہ تھا۔ دربار میں ایک میراثی داد دینے کی تنخواہ پاتا ہے۔ وہ اپنا فرض انجام دیتا رہا۔

ساتھیوں نے کاظم کو ٹوکا کہ بالکل سکوت مناسب نہیں۔ گاہے گاہے اِدھر سے بھی داد ملنی چاہیئے۔ خیر سے غُل مچانے میں سب شریک تھے۔ تنہا داد دینے کو کوئی راضی نہ ہوا۔

اب سلسلہ یوں چلا کہ جب تنخواہ یافتہ داد دہندہ چُپ ہو تو کاظم کچھ کہہ دے۔

مجھے ایک داؤں سوجھا۔ آنکھوں میں چمک آگئی۔ سر میں سرور پیدا ہو گیا۔

اس برخود غلط کو سرِ بزم میراثی سے ذلیل کراؤں گی۔

ناعاقبت اندیش کاظم اب بج رنڈی وار کرتی ہے۔

میں نے کہا، استاد ذرا ہوش میں آؤ۔ تمہاری نوکری پہ زد پڑ رہی ہے۔

بولا بمطلب۔

میں نے کہا۔ یہ جنٹلمین تم سے آگے بڑھ رہا ہے اور حضور کی نظریں بھی ادھر ہی ہیں۔

ڈوم۔ طامع۔ زرپرست۔ پیٹ کا کتّا۔ چوکنّا سا ہوا۔ روٹی چھنتی نظر آئی۔ چولہے میں پانی پڑتا۔ دکھائی دیا۔ بھڑک اُٹھا۔ آگ ہی تو ہو گیا۔

کاظم! اجالو نے بھُس میں چنگی ڈالی ہے اب ذرا شعلوں سے دامن بچا۔

فقرے چلنے لگے۔ ضد بحث کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کاظم کو بھی چڑھ گئی۔ زبان اس کا میدان ہے۔ یہاں کوئی اس سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ ایسے ایسے میراثی دو ضربوں میں بر دگ الاپ دیں گے۔ ایک سے ایک

بلند داد دیتا تھا۔ میراثی پھیکا پڑا جا رہا تھا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ دماغ سے اتار اتار کر باتیں لا رہا تھا۔

بولا۔ سرکار شانوں میں سے سر نکل رہے ہیں۔

کاظم نے کہا، عالی جاہ مجسّم موسیقی ہیں۔ ہر بُنِ مو سے سُر برس رہے ہیں۔

میراثی نے بہت زور مارا باپ دادا کی ساری لیاقت سے کام لیکر کہا۔ سرکار شہِ موسیقی ہیں۔

وہ حاضر دماغ بولا۔ عالی جاہ شہنشاہِ موسیقی ہیں۔ لحنِ داؤدی پائی ہے۔ اس فن کے پیغمبر ہیں۔

میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹیکا دئے اور بولا۔ تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہی۔

کاظم نے عرض کی۔ برجو باورے کی روح قدمبوس ہونے آئی ہے۔ اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ کے راگ میں نہ آتا۔ سُر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ راگ جلو میں حاضر۔ موسیقی دامن سے وابستہ۔ سرکار راجہ اندر ہیں۔ موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے۔ اعجاز ہے اعجاز۔ شجر و حجر جھوم رہے ہیں۔ مُردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں۔ سُر نہیں نفسِ عیسوی ہیں۔

میراثی کچھ بھی ہو میراثی تھا۔ کاظم کا سا دماغ اور علم کہاں سے لاتا۔ یہ تابڑ توڑ فقرہ سُنکر بَوراسا گیا۔ پر تھا وہ بھی ایک جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کیا اور لگا حال کھیلنے۔

یہ روگ کاظم کے بس کا نہ تھا۔ میدان جاتا نظر آیا۔ بازی ہرتی دکھائی

دی. پرواہ رے دماغ۔ قربان جائیے۔ فوراً بولا سُردوں کا زور ہے آگ لگ جائے گی۔ پانی ڈالو، جلدی کرو اور ساتھ کے ساتھ برف کے پانی کا بھرا ہوا جگ اُٹھا بدنصیب میراثی پر اُلٹ دیا اور بولا اور لاؤ، سُردوں کا زور ہے ابھی جل کر خاک ہو جائے گا۔

میراثی حال سے بے حال ہو گیا۔ کم بخت کی گھگی بندھ گئی۔ چار اٹھا کر لے گئے۔ سب نے منہ میں رومال ٹھونس لئے۔ میں غش غش کرتی رہ گئی۔

لیکن وہ پیل پیکر موسیقار بیٹھا چنگھاڑتا رہا۔

کانوں میں درد ہونے لگا۔ سر چکرا گئے۔ طبائع پر استفراغی کیفیت طاری۔ سب نے کاظم کو کوسنا شروع کیا کہ للّٰلہ نجات دلوا ہم مرے۔ وہ بھی عجیب مخمصے میں تھا۔ کرے تو کیا کرے۔ اس سیلابِ بلا کو روکے تو کیونکر باڑ باندھے تو کس طرح۔ اور وہاں یہ حال کہ موسیقی کا ایک سمندر تھا، کہ ٹھاٹھیں مارتا چلا آرہا تھا۔ سُردوں کو سر و پا کا ہوش نہ تھا۔ راگ سب راگ بھول چکے تھے۔ موسیقی جامہ دریدہ کھڑی تھی۔ سامعین جان دینے پر آمادہ۔ پر اور سننے کو راضی نہیں۔ در و دیوار سے آواز آرہی تھی۔

پنبہ ام در گوش کن تا نشنوم ٭ یا درم بکشائے تا بیروں روم

پرواہ رے طبع حاضر۔ ہماری طرف پلٹا اور ڈپٹ کر بولا۔ آپ لوگ یہاں کس لئے تشریف لائے ہیں۔ سرکار کے اعجاز نے ایسا محو کیا کہ ٹیک دے بدن کا ہوش نہ رہا۔ دیکھتے نہیں گلے پر بوجھ پڑنا شروع ہو گیا۔ جو نصیبِ دشمناں

ذرا بھی خراش پیدا ہو گئی تو سر پکڑ کر روؤ گے۔ ایسے نازک گلوں پہ بار نہیں ڈالتے۔ حضور کو تو کبھی کبھار دس پانچ منٹ کے واسطے تکلیف دی جا سکتی ہے۔ عالی جاہ تو تبرک ہیں، تبرک یہ دم مغتنم ہے۔

یہ کہتا ہوا اٹھا اور اپنا اونی مفلر جو قریب ہی رکھا تھا نواب صاحب کے گلے میں لپیٹ دیا اور کہا خدا نخواستہ ٹھنڈی ہوا نہ لگ جائے۔ اس گلے پر سے ہمارے سر نثار۔ خدا اس کو سلامت رکھے۔

محفل پر سکوت طاری تھا۔ سب کی نگاہیں اس ماہر ادا کار پہ جمی تھیں۔ بزم اسٹیج بن گئی اور اس پہ کاظم ہی کاظم نظر آتا تھا۔

قدرے خموشی کے بعد چاروں طرف نظر دوڑا کر ایک جادو گر کی طرح بولا، موسیقی کے دیوتا فضا میں منڈلا رہے ہیں۔ سُر بھٹک جائیں گے۔ ان کو آس ملنی چاہیے۔ سب جانتے ہیں کہ سرکار کے بعد کسی کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔ لیکن مجبوری ہے۔ ستارے بھو کی نظروں سے زمین کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ زہرہ تم شروع کرو اور جلد شروع کرو۔

الفاظ سے کھیلنے والے تیرا جواب نہیں۔ لیکن زہرہ بھی لاجواب ہے اب اس کا کمال دیکھ۔

گھونگرو باندھ ساڑی کو جھٹکا دے۔ زہرہ اُٹھ کھڑی ہوئی بست ناز اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بُت طناز اُٹھ کھڑی ہوئی محشر بدوش قیامت خرام اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کرۂ زمین جھوم جائیں گے۔ جرائم فلکی رقص میں آئیں گے زہرہ ناچے گی۔ ہاروت سے کہہ دو ہوش میں آئے۔ ماروت سے کہو دل

تھام لے۔ ہر ٹھوکر دلوں کو ٹھوکروں میں اڑائے گی۔ ہر گردش گردشِ روزگار ہوگی۔ گھونگروؤں کی جھنکار فلکِ ہفتم تک جائے گی۔ ملائکہ کو للچائیگی۔ انسان کس شمار میں ہیں۔ آج کروبیاں تسبیح بھول جائیں گے۔

زہرہ نہیں ناچ رہی۔ مینا گردش میں ہے۔ آتشِ سیال رقص کر رہی ہے۔ شعلۂ جوالہ سرگرداں ہے۔ کاظم خرمنِ خرد کو بچا، پھکا چاہتا ہے۔

کونین گردش میں تھے۔ دنیا فانوس خیال بنی ہوئی تھی۔ اہلِ بزم بُت بنے بیٹھے تھے۔ اِک بُتِ سیم پیکر گردش میں تھا ____ کہیں رُک گئی ____ آسمان و زمین رُکے ہوئے معلوم ہوئے۔

میری آنکھیں کاظم پر تھیں۔ وہ مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

بے ساختہ زبان سے نکلا۔

ان نینن نے کون منتر پڑھ پھونک بجاوے بانسریا
بر دائے زاہدِ خود بیں کہ ز چشم من و تو
راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد ماند
ان نینن نے کون منتر
خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق عالم کار نیست
ان نینن نے کون منتر
مرا زنّار و قشقہ دیکھ کر اک شخص نے پوچھا
کہ او کافر نظیری دشمنِ راہِ مسلمانی

M. Rashid
R/o Bijbehara (K)

تجھے تو ہم نے کل دیکھا تھا دینداروں کی محفل میں
کہاں سے آگیا تجھ میں یہ کبر و خبثِ شیطانی

کہا میں نے کہ او ناداں یہ کافر عشق وہ شے ہی
فرشتوں کی بھی روحیں جس پہ ہو جاتی ہیں دیوانی

فرشتے چیز ہی کیا ہیں خدا خود اس کا طالب ہے
چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ان نینن نے کون منتر پڑھ پھونک بجا دئے بانسریا

میں گاتی رہی گاتی رہی۔ یہ میری دنیا تھی۔ یہاں میں حکومت کرتی تھی، لیکن چند ساعت۔

گانا ختم ہوا۔ محفل برخاست ہوئی۔ میری بادشاہت ختم ہو گئی۔

کاظم مجھ سے کترا کر نکلا۔ میری آتشِ غیظ و غضب بھڑک اٹھی۔

آج کی رات زہرہ کی رات ہے، وہ بدلہ لیگی اور آج ہی لے گی۔

وقت کم ہے۔ کاظم موٹر تک جا پہنچا۔ موقع ہاتھ سے نکلا چاہتا ہے۔ مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھی میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں نے انہیں باتوں میں لگا لیا۔ ایک قصہ چھیڑ دیا۔ موٹر تک پہنچتے پہنچتے وہ ختم نہ ہوا ان کے اصرار پہ میں بیٹھ گئی۔ لیکن پیچھے کی سیٹ پہ۔ راستہ میں میرے گانے کا ذکر ہوا۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا۔ کہ میں پہلے کبھی نہ ایسا ناچی تھی نہ گائی تھی۔ ساتھ کے ساتھ کچھ اور سنانے کی بھی فرمائش کی۔ سب نے اصرار کیا۔ میں تو تُلی بیٹھی تھی گانا شروع کر دیا۔ لیکن جان کر برا گائی اور چیز

ادھوری چھوڑ دی۔ سب نے وجہ پوچھی، میں نے کہا ہوا گانے نہیں دیتی۔ آگے جو صاحب بیٹھے تھے وہ بولے آپ اگلی سیٹ پر تشریف لے آئیں۔ یہاں کی ہوا ونڈ اسکرین روک لیتا ہے۔

موٹر رکوائی گئی، میں کاظم کے پہلو میں جا بیٹھی۔

واللہ اعلم ہم لوگ کہاں کہاں پھرتے رہے۔

میں گاتی رہی۔ موٹر چلتی رہی۔ کاظم داد دیتا رہا۔

حتیٰ کہ آسمان پر صبح کے آثار نمودار ہوئے۔

کاظم نے کہا، رات ختم ہونے والی ہے۔ میں چونک سی گئی۔

زہرہ کی رات ختم ہونے والی ہے۔ بدلہ نہیں لیا گیا۔ زہرہ ناکام رہی۔ اس خیال کے ساتھ خون دماغ کی طرف چڑھ گیا۔ مجھے ہر سمت سرخ ہی سرخ نظر آنے لگا۔ کسی نے کاظم سے کہا موٹر تیز چلاؤ۔ اندھیرے میں شہر پہنچ جائیں۔ اس نے ایکسلیٹر دبا دیا۔ موٹر فراٹے بھرنے لگی۔ مجھ سے لطف اندوز ہونے والے میرے ساتھ اُجالے میں منھ دکھانا پسند نہیں کرتے۔ میں ان کا منھ کالا کر کے رہوں گی۔

کاظم ابھی رات باقی ہے۔ اور یہ رات زہرہ کی ہے۔ زندگی میں تو میری قسمت میں نہیں موت تجھے میرے حوالے کرے گی۔

زہرہ سے دامن بچانے والے ہمارا جنازہ ساتھ اٹھے گا۔

موٹر ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ میرے دماغ میں چکر آ رہا تھا۔ سامنے ایک تناور درخت نظر آیا۔ میں نے اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ مارا۔ ایک دھماکا ہوا۔ دھچکا لگا۔ میں چیخی اور پھر سیاہی چھا گئی۔

اخبار والوں سے اس کا تعلق، پولیس میں رسوخ، افسروں پر اثر۔ شریف کے سو دوست۔ ایک دوسرے کی پردہ داری کریں۔ ورنہ سب کی پردہ دری ہو جائے۔ بات دبا دی گئی۔ اور بات کچھ ایسی بڑی تھی بھی نہیں۔ موٹر چکنا چور ہو گئی۔ سواریوں کے معمولی زخم آئے۔ مرا کوئی نہیں۔ نہ زہرہ مری نہ کاظم کی بدنامی ہوئی۔ ایک پادری صاحب اُدھر سے گذرے سب کو اپنی موٹر میں ڈال لائے کچھ دن تیمارداریاں اور بیمار پرسیاں ہوتی رہیں۔ پھر سب اچھے بھلے ہو بیٹھے۔

سماج نے مجھے پھر دھوکہ دیا۔ کاظم کی حمایت کی۔ اسے بدنامی سے بچا لیا۔ سماج کا سپوت تھا اسکی عزت پر دھبہ آنا نامناسب۔ سوسائٹی آڑے آئی۔ ڈھال بنی۔ اس کی حفاظت کی۔ اخباروں کی زبان بند ہو گئی۔ زمانہ خموش ہو کر رہ گیا۔

سماج۔ سماج۔ سماج۔

سماج نام ہے۔ دغابازوں۔ غداروں۔ جعل سازوں کی گرگ آشتی کا۔ سماج نام ہے چوروں کی جتھا بندی کا مولوی۔ مُلا۔ پنڈت مہاشے کے خود ساختہ قواعد کا۔

اسی سماج نے سیتا جی کو بن باس دلایا۔ اسی سوسائٹی نے حضرت عیسٰیؑ کو صلیب پر چڑھوایا۔ اسی معاشرہ نے حضرت ابراہیمؑ کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈلوایا۔

لیکن سیتا جی واپس آئیں۔ حضرت عیسیٰ چوتھے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ نارِ نمرود گل ہوئی گلزار بنی۔

سماج کی افترا پردازیاں شعبدہ ہیں معجزہ نہیں۔ چند روزہ ہیں دائمی نہیں۔ ناپائدار ہیں پر ثبات نہیں۔

مٹ جاتی ہیں ٹکتی نہیں۔ بھان متی کا کھیل ہیں۔ ڈھٹ بندی ہیں۔ سحر سامری ہیں۔ اعجاز موسےٰ نہیں۔

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

اس سماج نے جسے ابھارا اسے گرایا۔ جسے سرفراز کیا اسے سرنگوں کر دکھایا۔

کاظم غرور نہ کر۔ اس عشوہ کار کی یہی فریب کاریاں ہیں۔
بیک چشم زدن تخت پر لے جا بٹھاتی ہے بدنگر تختہ پہ پڑا دکھاتی ہے۔
بیک گردشِ چرخ نیلوفری ❊ نہ نادر بجا ماند نے نادری

میں اور تو کیا چیز ہیں یہ ظالم معاشرہ تاج و تخت سے کھیلتا رہا ہے اور کھیلتا رہے گا۔ اسی کے دست تماشہ ساز نے میرے تیرے دیکھتے امان اللہ پہ سے دستِ امان اٹھا لیا۔ تاجِ شاہی بچہ سقہ کے سر پہ جا رکھا۔ پھر تاج کے ساتھ سر بھی اتار لیا۔

قیصر ولیم کو نظر بند کیا۔ ایک غیر معروف شخص کو فیورہر بنا دیا۔
زار روس کو بحالتِ زار نکالا۔ مزدوروں کو بر سر کار لایا۔

ابھی رات اور دن ختم نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی گردشِ لیل و نہار
باقی ہے۔ زہرہ کی رات پھر آئے گی تجھے بُرا دن دیکھنا ہو گا۔

یہ بے وفا سماج تیرا ساتھ چھوڑ دے گا۔ یہ معاشرہ تجھ پر سے دستِ
حمایت اُٹھا لے گا۔ سوسائٹی تجھے نظر انداز کر دے گی۔ یہ بنی کے لاگو
ہیں۔ اور یہاں کِس کی بنی رہی ہے کِس کی بنی رہے گی۔

چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔ آج داؤں نہیں
چلا کل چلے گا۔ زمانہ گھات میں ہے زخمی زہرہ تاک میں سوسائٹی
کی حمایت پر نہ پھول۔ اسی سماج نے۔ اسی سوسائٹی نے۔ اسی معاشرہ
نے راجہ نل سے بھیک منگوائی۔ شاہِ اسپین سے نیویورک کی گلیوں
میں دریوزہ گری کروائی۔

دنیا زنیست عشوہ گرو دلستاں ولے
باکس بسر نمی برد ایں عہدِ شوہری

یہ سوسائٹی گرگٹ کے سے رنگ بدلتی ہے۔ ہر چمکتے ہوئے
سورج سے آنکھ لڑا لیتی ہے۔ اس طوطا چشم کو آنکھیں پھیرتے
دیر نہیں لگتی۔

اس کی حمایت رفاقت اور دوستی وقف ہے منتخب چند کے
لئے۔ چند روز کے لئے۔ اس کا آغوشِ الفت آرام گاہ ہے معدودے

چند کے لئے اور چند شبانہ روز۔ پھر لیل و نہار کی طرح کروٹ بدلتی ہے اور کچھ ایسی بدلتی ہے کہ مُڑ کر بھی نہیں دیکھتی۔

اس کے قوانین۔ قواعد و ضوابط بنتے عوام کے لئے ہیں کام خواص کے آتے ہیں۔

دو دن کی بات ہے سردار ا بدمعاش رات کے دو بجے برابر والے کوٹھے پر چڑھا۔ وہ غریب تھکی ماندی سوئی تھی۔ دروازہ نہیں کھولا۔ وہ ٹھیرے دس نمبر یہ لٹھ بجانے شروع کر دئے۔ یہ بازار رات بھر چلتا ہے سڑک پر بھیڑ لگ گئی۔ متفقہ طور پر سب کی یہ رائے تھی کہ رنڈی کو اپنے گھر کا دروازہ بند کرنے کا کوئی حق نہیں۔ شریف رات کو نہ آئینگے تو کیا اس کے گھر دن کو آیا کریں گے۔

توڑ دو دروازہ کی صدائیں بلند تھیں۔ مغلظات پڑ رہی تھیں۔ سپاہی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ غریب دیوار پھاند ڈری سہمی میرے ہاں آ گئی۔ بڑھے نوکرنے برآمدہ میں سے کہا وہ ہیں نہیں۔ لوگوں کو یقین نہ آیا۔ دروازہ کھولا گیا۔ کونے کونے کی تلاشی ہوئی۔ بیچارہ بوڑھے کے دو چار چپت پڑے۔ قصہ رفع دفع ہوا۔ صبح کو گھر کی دس پانچ چیزیں غائب تھیں۔

یہی قانون جو چور ڈاکو اور خونی کا دروازہ بغیر عدالتی اجازت کے کھولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک رنڈی کا دروازہ بند ہونا روا نہیں رکھتا۔

سچ یہ ہے کہ ہم بے گھر ہیں بے در ہیں۔

گھر نام ہے زمین کے اس ٹکڑے کا جہاں رہنے والے کا قبضہ ہو جسے چاہے وہاں آنے دے جسے چاہے روک دے۔ اب وہ خواہ جھونپڑی ہو خواہ قصر شاہی۔ کوٹھی ہو یا مکان یا سر رہگذر دو گز زمین۔

جوگی کی کٹی میں کوئی بغیر اجازت قدم رکھے تو دنیا اسے بُرا کہتی ہے۔ فقیر کی جھونپڑی میں بھی آنے والا پوچھ کر آتا ہے۔

ہمارا گھر گھر نہیں شارع عام ہے۔ بلکہ شارع عوام ہے۔ جو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے چلا آتا ہے۔ راتوں کو دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں اگر نہ کھولو سوتے بن جاؤ تو پتھر برسائے جاتے ہیں اور قانون مزاحم نہیں ہوتا۔

ہم پبلک پروپرٹی ہیں۔ ہمیں تخلیہ کا حق نہیں۔

لیکن قانون تو پبلک پروپرٹی کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ اڈورڈ پارک پبلک پروپرٹی ہے اس کے دروازے رات کو بند کر دئیے جاتے ہیں۔

پھر ہماری حفاظت کیوں نہیں کی جاتی۔ ہمیں سکون کیوں نہیں دیا جاتا۔ ہمیں چند لمحوں کے لئے نجات کیوں نہیں ملتی۔ چوکیدار سماج ہماری رکھوالی کیوں نہیں کرتا۔

باغ کو وحوش سے بچانے کے لئے بند کیا جاتا ہے۔ اسکے دروازہ سدِّ جرم کے لئے مسدود کئے جاتے ہیں۔ ہم تو وحشیوں کیلئے تخلیق کی گئی ہیں۔ ہم مجسم جرم ہیں۔ ہماری حفاظت کیا معنی۔

روم جو قانون سازی میں مشہور تھا اور مشہور ہے اریناؔ میں گلیڈیٹرز

کو درندوں کے سامنے ڈال دیتا تھا وہ پالے اسی لئے گئے تھے۔ ان کا مقصدِ حیات یہی تھا۔ پرزروڈ فورسٹ۔ رمنا اور رکھی کے جانوروں کی حفاظت اسی لئے کی جاتی ہے کہ انہیں نذرِ تفنگ کیا جائے۔

ہم دست بُرد عوام کے لئے پرورش کئے گئے ہیں۔ ہمارا مقصدِ زندگی یہی ہے۔

پانسہ بنایا ہی اس لئے جاتا ہے کہ پھینکا جائے۔

لیکن او پھینکنے والے ہاتھ یاد رکھ۔ یہی پانسہ ایک روز تیری قسمت کا پانسہ پلٹ دیتا ہے۔ یہ بے زبان تیری دست بُرد میں رہتا ہے۔ لیکن ایک روز تیرے سرمایہ پر ایسا ہاتھ مارتا ہے کہ تو ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

سپیرے کو سانپ ڈستا ہے۔ نٹ بانس پر سے گر کر مرتا ہے۔

موجوں کے سینہ پر تیرنے والے کو ایکروز موجیں نگل جاتی ہیں۔

مردِ ہم کو شکار کرتے ہیں انجام کار خود ہمارا شکار بنتے ہیں۔

تہذیب نو کو ترقی کی ناگن ڈس جائے گی۔ سائینس کی حیات بخش طرفہ کاریاں مرگ انسانی کا سبب بنیں گی۔ ہوا پر لیکر اڑنے والے طیارے موت برسائیں گے۔ مزدور کا لہو چوسنے والی کلیں سرمایہ دار کو نگل جائیں گی۔

موجودہ تمدن قارون کا خزانہ ہے جو اسے تہِ خاک لے جائے گا۔

دیپک کے سُر ہیں جو آشیانہ پھونک دیں گے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

مسٹر عربی النّسل پیشہ وکالت اختر کے دوست نام میاں خورشید روز شام کو موٹر لے کر آتے ہیں۔ مجھے ہوا خوری کرواتے اپنی ہوا خواہی جتاتے ہیں۔

اختر جلی مرتی ہے۔ دنیا بھر میں میری برائی کرتی پھرتی ہے کہ میں نے اس کا دشمن چھین لیا۔ خود غرض تو لے اسے اس کی بیوی سے چھینا تھا۔ بیوی نے ماں باپ سے۔ ماں باپ نے اس حیاتِ پرسکون کی گود سے چھینا تھا جہاں رات ہے نہ دن۔ رنج ہے نہ خوشی۔

دُنیا نام ہے اس تصادم نزاع۔ کشاکش اور چھینا جھپٹی کا۔ ایک کے مُنھ سے ایک چھین رہا ہے۔ انسان انسان نہیں گدھ ہیں۔ چیل کوّے ہیں۔ زاغ و زغن ہیں۔ صورت میں انسان سیرت میں جانور اور جانور بھی حریص۔ کہنے کو اشرف المخلوقات حقیقت میں ارذل ترین۔

افراد سے افراد چھین رہے ہیں۔ اقوام سے اقوام۔ مذاہب سے مذاہب۔

پادری صاحب صلیب لٹکائے اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان کا حق ہے۔ ہم زخمیوں کو سڑک پر سے اٹھا کر لائے تھے۔ اوّل اوّل تو بیمار پرسی کے لئے آتے رہے۔ اب دلبستگی کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ خیر سے رنڈی کے کوٹھے پر بھی ثواب کماتے ہیں۔ گاہے گاہے وعظ و تلقین فرماتے ہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا۔ تم حضرت عیسےٰ کی پیدائش کو معجزے کی پیدائش مانتے ہو۔ میں نے کہا بے شک۔ بولے یعنی بے باپ کے پیدا ہوئے۔ مَیں نے اس اعتقاد کو جزوِ ایمان بتایا۔ فرمایا بس تمہارے مذہب کے مطابق بھی وہ آدھے خُدا ہوئے یعنی ان میں آدھا حِصّہ خُدا کا ہے۔ میں نے عرض کیا لیکن ایک بات ہے۔ فرمایا وہ کیا۔ میں نے کہا اس استدلال کے تحت حضرت آدم کو پورا خدا ماننا پڑے گا۔ چونکہ وہ ہمارے اور آپ کے اعتقاد کے مطابق قطعاً بغیر ماں باپ کے عالمِ وجود میں آئے۔ اس پر پادری صاحب گھبرائے۔ کوئی جواب بن نہ پڑا۔ فرمایا روشنی کی کمی ہے۔

شمعِ مذہب کو فانوس حکومت کی آڑ میں لے کر چلنے والے مجھے روشنی دکھانی چاہتے تھے۔ بھیڑیئے بھیڑوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ پیٹ پال پادری اپنی تنخواہ حلال کرنی چاہ رہے تھے۔ مشن کمیٹی میں اپنی کارگذاری دکھانے کے متمنی تھے۔

سب میرا جسم خریدنے آتے ہیں، یہ میرے ایمان کے دام لگا رہے تھے۔ سنہری دانہ ڈال رہے تھے۔ چاندی سونے کا جال بچھا رہے تھے۔ یہ تو میرے پاس بھی تھا۔ میری ٹھوکروں سے لگا تھا۔ میرے اشاروں پر آتا تھا۔ لکشمی دیوی وشیا کے سمان ہیں۔ وشیا سے پرہیز نہیں کرتیں۔

ہاں انہوں نے ایک اور لاسہ دیا جس پر میرے پیروں کو لغزش ہو سکتی تھی۔ قدم ڈگمگا سکتے تھے۔ وہ چوگا دیا جس کو مَیں ترستی تھی۔

جس کی میں پیاسی تھی جس کی میں بھوکی تھی۔ وہ چیز پلیٹ کی جسکی کمی میں اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کرتی تھی۔

عزّت۔ وقار اور آبرو کا لاسہ دیا۔

خون دماغ کی طرف گیا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کانوں میں کاظم کی آواز گونجی۔ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

پادری صاحب زہرہ جسم فروش ہے۔ ایمان فروش نہیں۔

آج جشنِ صحت ہے۔ زخم مندمل ہو گئے ــــــ کاش نہ ہوتے۔

جُوں جُوں جسم کے زخم بھرتے گئے دل کے اُبھرتے گئے۔

اُس حادثہ کے بعد آج پہلی مرتبہ کاظم سے مُلاقات ہو گی۔ کیونکر مُنھ دکھاؤں گی۔ غریب کو دس ہزار کا زخم دیا۔ موٹر چکنا چور ہو گئی۔ نبادلہ میں ایک ہزار بھی نہیں لگا۔ بس لوہے کے دام اُٹھے۔

دس ہزار کا چک کاظم کو بھیجدیا جائے گا ــــــ گاڑی پُرانی ہو چکی تھی۔ میں نئی کے دام دیدوں گی۔ چاندی سونے کی ٹھیکریوں اور کاغذ کے پُرزوں کے لئے زہرہ شرمندہ نہیں ہو گی۔

لیکن اس کے زخم بھی تو آئے۔ زخم زہرہ نے بھی کھائے ــــــ ایسا ہی ہے تو ڈاکٹر کا بل بھیجدیں اَدا کر دیا جائے گا۔

زہرہ! روپیہ کی تو اسے پرواہ نہیں۔ لیکن جانِ نہار تو اسکی جان سے کھیلی ــــــ یہ سچ ہے کہ میں اس کی جان سے کھیلی لیکن اپنی جان پر کھیل کر۔ برابر کے داموں میں سودا خرید رہی تھی۔ اپنی جان دے رہی تھی اس کی لے رہی تھی۔

میں ان خیالات میں غرق تھی کہ کسی نے کان میں کہا۔ زہرہ!

جان کی تو کاظم کو بھی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اس کی عزّت پہ ہاتھ ڈالا تھا
——— میں نے کہا کیا جان دے کر بھی عزّت نہیں خریدی جا سکتی۔
جواب ملا عزّت جان سے مہنگی ہے۔ میں نے کہا۔ جب اس دنیا سے تعلق
ہی نہ رہا تو یہاں کی عزّت اور بے عزّتی کیا۔ آواز آئی زہرہ تو غلط سمجھ
رہی ہے۔ عزّت جان کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ ہاں جان عزّت کے
ساتھ جاتی ہے۔ عزّت حیات بعد الموت ہے اور ذلت موت قبل الموت۔

سچ یہ ہے کہ میں نے اس کی عزّت پہ ہاتھ ڈالا تھا حقیقت یہ ہے
کہ میرا یہی ارادہ تھا۔ لیکن اس بازار تکوین و ایجاد میں، اس قصاد
قدر کی منڈی میں زہرہ یہ سودا خرید نہ سکی۔ وہ کم مایہ تھی۔ زخم دے
رہی تھی زخم کھا کر جان لے رہی تھی جان دے کر۔ عزت کا تبادلہ
عزّت سے ہو سکتا تھا اور اس دولت سے ایک رنڈی محروم ہے۔
نہیں محروم کر دی گئی ہے۔

مردوں نے میری عزّت لی ہے میں اُن کی عزّت لے سکتی
ہوں ——— ہاں لے سکتی ہے لیکن صرف اُن مردوں کی جو تیری
عزّت کے درپے ہیں۔ تو گریبان میں ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ لیکن اُس
گاہک کے جس سے تیرا لین دین ہے۔ تو مطالبہ کر سکتی ہے لیکن اُس
بیوپاری سے جو تجھ سے بیوپار کر رہا ہے۔

رنڈی تماشبین کی عزّت لے سکتی ہے شریف کی نہیں۔
سانپ سپیرے کو ڈستا ہے۔ آگ آتش باز کو جلاتی ہے۔

کانٹا مالی کی اُنگلی میں چُبھتا ہے —— جو گلہائے رنگا رنگ سے پرہیز کرے اس چمن سے گریز کرے۔ دستِ قدرت اس ہاتھ میں کانٹا نہیں لگنے دیتا۔ جو عالمِ رنگ و بو سے دامن کشیدہ جاتا ہے اس پہ چھینٹے نہیں پڑ سکتے۔ وہ آلودہ دامن نہیں ہو سکتا۔

لیکن کاظم نے بھی تو یہ کاروبار کیا ہے۔ اس بیوپار میں حصّہ لیا ہے —— بے شک مگر اس وقت کا لین دین ختم ہو گیا۔ پھاگ کھیلنے جاتا تھا۔ چھینٹے کھاتا تھا۔ چھینٹے اڑاتا تھا۔ اَب دامن کے دھبے دھوئے ہیں اس پر دھبّہ نہیں آ سکتا۔ پہلے عزّت لیتا تھا عزّت دیتا تھا۔ اب اپنی عزّت سنبھال کر بیٹھا ہے۔ قدرت اس کی محافظ ہے۔

پھر ان محفلوں میں آتا کیوں ہے؟ آتا ہے لیکن بچکر جاتا ہے۔ تاہم آتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھگت لیگا اور بھگت لیا —— قدرت کا وار خالی نہیں جاتا۔ تفریح کی تھی کوفت اٹھالی۔ مفت کی چوٹ کھائی دس ہزار کی رقم گنوائی۔ نہ عزّت لی تھی نہ عزّت پر آنچ آئی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ جتنی کرنی اتنی بھرنی۔

اختر کے دوست تازی النسل نام میاں خورشید موٹر لیکر آن پہنچے۔ مَیں بنی سنوری تیار بیٹھی تھی۔ ہورن کی آواز سنتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور موٹر میں جا براجی۔ وہ بولے آج تو غضب کا نکھار ہے۔ میں نے کہا سچ اور تصدیق کرنے کے لئے ونڈسکرین پر جو شیشہ لگا تھا اس میں دیکھنے جھکی۔ خورشید نے بھی ذرا شانہ میری طرف سرکا دیا۔ ہمارے جسم چھو گئے۔

آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ مُسکرائے میں نے نگاہیں نیچی کرلیں اور الگ کو ہو بیٹھی۔ اختر اپنے برآمدہ میں سے دیکھ رہی تھی۔ جل کر خاک ہو گئی۔ موٹر پہ تھوک دیا۔

حسد کی آگ ہو اس پھونک دیتی ہے۔ یہ شعلۂ سوزاں کاظم پہ بھی آزماؤں گی۔

ایک پرائیوٹ باغ میں پارٹی تھی۔ کاظم پہلے سے پہنچا ہوا تھا میں خورشید کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے اُتری۔ وہ دیکھ رہا تھا میں اپنے ساتھی کے ذرا اور قریب ہو گئی۔ اب نہ صرف ہمارے ہاتھ ملے ہوئے تھے بلکہ ہمارے جسم بھی ٹکراتے ہوئے چل رہے تھے۔

خورشید صاحب کے قدم چھوٹے چھوٹے پڑنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی تمنا ہے کہ یہ دس گز کا راستہ ختم ہی نہ ہو میں بھی اٹھلا اٹھلا کر پیر اٹھانے لگی۔ خورشید کا چہرہ سُرخ تھا۔ مسرت آنکھوں سے ٹپکی پڑتی تھی۔

ہتوڑا خوش تھا کہ کندن پر پڑ رہا ہوں۔ سر ہتوڑے کا ٹکرا رہا تھا۔ زیور کسی اور کے لئے گھڑا جا رہا تھا —— خورشید آلۂ کار تھا۔ نظر کاظم پر تھی۔

وہ مجھے دیکھتے ہی تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھتی تھی۔ خفا ہو گا۔ ناراض ہو گا۔ بگڑا ہوا ہو گا۔ لیکن اس کے خلاف پایا۔ وہ تو پہلے سے کچھ زیادہ متواضع تھا۔

وہ دنیا سے مختلف۔ عام روش سے الگ ہے۔ یہی اچھوتی ادا مجھے پسند ہے۔

میری طرف بڑھا۔ خیریتِ مزاج دریافت کی۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی لیکن ڈھٹائی سے کام لیا اور کہا۔ آپکی بَلا سے۔ کبھی جھوٹے مُنہ آن کر پوچھا بھی نہیں۔ آنکھیں نیچی کر کے بولا کیا عرض کروں کم بخت فرصت ہی نہ ملی۔ میں نے کہا ایسی بھی کیا مصروفیت تھی۔ کاظم جواب دینے نہ پایا تھا کہ برابر سے ایک صاحب بولے۔ یہ تو ہسپتال میں تھے ابھی دو دن ہوئے جو نکل کر آئے ہیں۔

مَیں نے کاظم کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا وہ نظریں بچا گیا مجھ پر شرمندگی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ مجھ سے تو کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ کیوں خورشید صاحب آپ نے بھی ہمیشہ میرے دریافت کرنے پر یہی فرمایا۔ اچھے ہیں معمولی خراشیں آئی ہیں۔ خورشید صاحب کچھ خموش سے ہو گئے۔ کاظم نے جواب دیا یہ خطا میری ہے۔ مَیں نے سب احباب کو تاکید کر دی تھی کہ آپ کو اطلاع نہ کریں۔ مَیں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا یہ آخر مجھ سے پردہ داری کس لئے کی گئی۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ آپکو پشیمان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میری آنکھیں اس جواب کی تاب نہ لائیں اور جُھک گئیں۔

اتنے میں میرا بابائی لالہ پنّالال جی کے ساتھ آئیں۔ کاظم کا قاعدہ تھا

کہ وہ ہر عورت کی تعظیم دیتا تھا۔ سب بیٹھے رہے لیکن یہ حسب وضع سرو قامت استادہ ہو گیا اور ہیرا بائی کو سلام کیا۔ انہوں نے بے اعتنائی سے جواب دیا ——— میں یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ کاظم کی نگاہیں معاً میری طرف پڑیں۔ میری آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے غصّہ کو مشکل سے ضبط کر رہا تھا۔

ہیرا بائی ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ یہ اپنی کرسی پر سے اُٹھا اور مُسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ میں اس کے چہرہ کے اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن وہ تبسّم جو بھرپور وار کرتے وقت کسی نبرد آزما کے چہرہ پر ہوتا ہے۔

پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ ہیرا کی طرف بڑھا۔ وہ گدّے والی کرسی پر متمکن تھیں۔ یہ قریب جا اس کے آرم پر ہو بیٹھا اور بولا۔ ہیرا بائی مدّتوں میں درشن دئے۔ ہم تو صورت کو ترس گئے ——— ایک وہ زمانہ تھا جب ہم آپ کو روزانہ سرِراہ بیٹھا دیکھتے تھے یا اب برسوں گذر جاتے ہیں اور یہ رُخِ روشن دیکھنے ہی میں نہیں آتا۔

محفل میں کاظم جب بات کرتا ہے تو سب اس کی طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں ازاں جملہ اس وقت بھی تمام کان ادھر لگے تھے اور آنکھیں بھی۔

بولا صاحب واللہ اعلم ان کی نانکہ بی رمّو جگّو کو کیا مزا آتا تھا جب بھی انہیں کام کاج سے مہلت ملتی دیوالی کی کلیا بنا برآمدہ میں

بٹھادیتی تھیں۔ ہم اس زمانہ میں نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ روز انھیں دیکھتے اور ترستے ہوئے گذر جاتے۔ غضب کا روپ تھا۔ ہماری تو کوئی اس وقت بارہ تیرہ برس کی عمر تھی پر خیر سے ان پر جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ سو خیال کیجئے جب کے گھائل ہیں ——— پر صاحب خدا بھلا کرے پنّالال جی کا انہیں راج رجوارے ہیں ——— ایک وہ زمانہ تھا جب یہ رات بھر کی تھکی ماندی صبح ہی اُٹھ رہّو جگنو کے لئے دوائیاں گھوٹتیں۔ ناشتہ تیار کرتیں۔ اس سے فراغت پا گھر کی جھاڑو بُہارو میں لگ جاتیں۔ اتنے میں کم بخت اُستاد نازل ہو جاتے۔ صاحب یہ بھی بڑا موذی گروہ ہے۔ سنگدل ان غریبوں کو گرزوں سے مارتے ہیں۔ کیوں بی ہیرا بائی اب بھی تمہیں کبھی کبھی تو وہ مار یاد آجاتی ہوگی ——— ہاں تو جناب کوئی دو گھنٹہ یہ بیچاری ان کی زدوکوب میں رہتیں۔ اتنے میں وہ جان کی لیوا بڑھیاں نہا دھو کر فارغ ہوتیں اور یہ بمنزلہ یہ جاچو کا باسن کرتیں۔ جو اتنے میں کوئی وشنی آگیا تو مُنہ ہاتھ دھو گُڑیا سی بن آن بیٹھیں نہیں تو بارہ ایک بجے تک چولہا دھونکتی رہیں۔ ہم نے ان سیپی سی آنکھوں کو اکثر دھوئیں کے اثر سے سُرخ دیکھا ہے وہ بھی ایک مُصیبت کا زمانہ تھا پر شکر ہے ان کی جان کی سلامتی میں کٹ گیا۔ کوئی بارہ تو غریب کو یوں بچ جاتے ٹھیک ایک بجے کہیں سے ڈولی آنازل ہوتی اور کہار چیخنا شروع کر دیتے تھے۔ کوئی پانچ بجے وہاں سے کملائی مُرجھائی مسلی وسلی آتیں

پھر نہا دھو چڑیاسی بن اُڈے پر ہو بیٹھتیں ـــــــ لیکن صاحب ایک بات ہے یہ پہاڑی کاٹھی تھی جو اتنی کھکیڑ بھگت گئی جو کوئی پاتر ڈیرہ دار ہوتی تو چیں بول دیتی۔

سارا کچا چٹھا کھول ہیرا کی زندگی کا فلم دکھا۔ تمام دکھتی ہوئی رگیں دبا کرسی پر سے اس طرح اٹھا جیسے ماہرِ فن سرجن اوپریشن کرکے داستانہ اتارتا ہوا جائے۔ ظالم نے زیادہ سے زیادہ ذلیل کیا۔ ہیرا کو پسینے آ گئے لیکن کچھ کہہ نہ سکی۔ کوئی بات حدِ ادب سے باہر نہ تھی۔ شکایت کی گنجائش نہیں۔ ہمدردی کر رہا تھا۔ برا ماننے کی کوئی بات نہ تھی۔

اب سورج غروب ہو رہا تھا ایک روسی خیالات کے کومریڈ (Comrade) بولے۔ مزدور تمام دن کی محنت مشقت کے بعد سُرخرو آرام کرنے جا رہا ہے۔

دوسرے ان کے ہمخیال نے کہا سرمایہ دار ہے۔ تمام دن زمین کا لہو چوستے چوستے اب چہرہ تمتما اٹھا ہے۔

ایک شاعر نے فرمایا۔ سُرخ پوشے بسرِ چرخ نظر می آید۔

خورشید بولے۔ خورشیدِ فلک زہرہ کے لئے میدان خالی کر رہا ہے۔ اب رات کی رانی اس سنگھاسن پر براجمان ہو گی۔

ایک رازداں کے منہ سے نکلا۔ جناب کو سدا اختر ہی سے شوق رہا خورشید نے جواب دیا۔ پہلے عام تھا اب خاص ہو گیا ہے۔

ایک طرف سے آواز آئی۔ دُلہن حجلۂ عروسی میں جارہی ہے۔

ایک میخوار نے کہا۔ شرابِ ارغوانی کا قرابہ سیہ مست کے قبضۂ قدرت میں آرہا ہے۔

کاظم خموش تھا ایک صاحب بولے۔ کاظم کی موٹر آسمان سے ٹکرائی ہے۔ بُتِ مغرب کے سر سے خون بہ نکلا ہے۔

میں نے کہا۔ جی نہیں روشن ضمیر سیاہ کاری کے دامن میں آرام تلاش کرنے جارہا ہے۔

کاظم بولا۔ اپنی لغزش پر نادم ہے خون کے آنسو رو رہا ہے۔

میں نے کہا۔ تاہم جارہا ہے۔

ارشاد ہوا۔ جی ہاں جارہا ہے۔ رات تاریکی کے دامن میں گذاریگا لیکن اپنے دامن پر دھبّہ نہ آنے دیگا۔ صبح پھر اسی آب و تاب سے روشناسِ عالم ہوگا۔

کاظم کیا تو درحقیقت زہرہ کی دوستی کو بدنما داغ تصور کرتا ہے —— کیا تو اب اس رنگ سے دامن بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ چھینٹوں سے بچنا چاہتا ہے۔

ہولی کی محفل میں آئے گا اور رنگا نہیں جائے گا۔ بزمِ زہرہ میں جائیگا اور گردشِ چرخ سے بچ جائیگا۔ انجمن طرب میں شریک ہوگا اور مطربہ کی زد میں نہیں آئے گا۔

خود فریب ایسا ہو نہیں سکتا —— نیک نام رہنا ہے تو بدناموں سے

دُور رہ۔ شرابی نہیں کہلانا تو بزمِ مے سے پرہیز کر۔ کانٹوں سے بچنا ہے تو گلبن سے بچ۔ دامن کو داغ سے محفوظ رکھنا ہے تو بھٹی کے پاس نہ جا۔ آگ سے بچنا ہے تو آتش خوروں سے نہ مِل۔

دامن کی سلامتی چاہتا ہے تو دامن دریدگاں کے پاس نہ آ۔ شراب سے بچنا ہے تو میخواروں سے بچ۔ دستارِ فضیلت سلامت رکھنی ہے تو کج کلاہوں سے کترا کے جا۔ قبائے پارسائی کی بقا چاہتا ہے تو کوتاہ آستینوں سے دامن کشیدہ رہ۔

ہم جیسے رندوں میں آئے گا تو بچکر نہیں جائے گا۔ کب تک خیر منائے گا۔ ایک نہ ایک دن رنگا جائے گا۔

کاظم اپنے کو دھوکا نہ دے۔ تیرا ان محفلوں میں آنا اس کا ثبوت ہے کہ:۔ ہے دل میں شیخ کے ابھی حسرت گناہ کی ؎

زہرہ کا شکار ابھی لاسہ کا چٹخارہ بھولا نہیں۔ دلدادۂ رنگ و بو پر سے یہ رنگ ابھی اُترا نہیں۔ آتش خورہ کو انگاروں کی یاد ابھی آتی ہے۔ آبِ آتش دار کے شائق کے سینہ میں آگ ابھی باقی ہے۔ بلبل کے دل سے یادِ گل ابھی گئی نہیں۔ خوف خلشِ خار پہلو تہی کروا رہا ہے۔ قمری کو یادِ سرو ابھی تڑپا تی ہے۔ ولے برقِ آشیاں سوز مائل بقفس کرتی ہے۔

فطرت کی چنگاری ابھی موجود ہے عقل کے چھینٹوں نے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ صرف ہوا دینے کی ضرورت ہے۔

رات ہو گئی۔ دورِ جام شروع ہوا۔ میں نے بھر بھر کر سب کو دیا۔ کوئی چلو میں الو ہو گیا کسی میں زیادہ ظرف تھا۔ پیتا جاتا تھا اور مانگتا جاتا تھا۔ مجھے خورشید نے خود بھر کر دی۔ میں نے اسی کے ہاتھ سے پی۔ کاظم کے جذبات کی چنگاری کو حسد کی ہوا سے بھڑکانا چاہ رہی تھی لیکن اس سرد مہر پہ کچھ اثر نہ تھا۔

اختر کا گاہک بگڑ رہا تھا۔ خورشید دیوانہ بن رہا تھا۔ زہرہ اپنی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن کاظم کو لغزش کیسی جنبش بھی نہ تھی۔

طبلہ کھڑکا۔ سارنگی کی صدا بزم سے بلند ہوئی۔ مجیرے بجے۔ میں نے یہ چیز شروع کی :-

گر زدستِ زلف مشکینت خطائے رفت رفت

ور زہندوئے شما برما جفائے رفت رفت

میں مقطع گاتی ہوئی کاظم کی طرف بڑھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ اپنی جگہ لے جا بٹھایا اور خود اس کی جگہ نہایت ٹھسّے سے ہو بیٹھی۔

ظالم نے وہ غزل شروع کی جس کا مطلع ہے :-

مشورے ہیں مجھے مٹانے کے

حوصلے دیکھنا زمانے کے

M. Rashid.
M.A. previous (Urdu)
Semester II. ROLL NO 3.
Session 86
University of Kashmir.

آج عید ہے۔ سب بازاروں میں دُکانیں سجائی گئی ہیں۔ اس بازار میں عورتیں سجا سجا کر بٹھائی گئی ہیں —— بردہ فروشی قانوناً ممنوع ہے عصمت فروشی جائز۔

سب چیزیں دن دہاڑے کھلے ڈُلے خریدی جاتی ہیں۔ یہاں کی گاہکی اندھیارے میں مُنہ چھپا کر ہوتی ہے۔

ایک آتا ہے تو دوسرا چھپ جاتا ہے۔ زینہ میں مٹ بھیڑ ہو جائے تو رومال حائل آتا ہے۔ دُنیا بڑی پردہ دار ہے۔ عجب آنکھ مچولی ہے۔ باپ کو بیٹے کی خبر نہیں بیٹے کو باپ کی۔ والد بزرگوار کہاں شوق فرماتے ہیں اور فرزندِ جواں سال کس دُکان سے خرید فرماتے ہیں یہ سب پردۂ راز میں ہے۔

دُکانیں تھوڑی ہیں اور گاہک بہت۔ دستِ قدرت اکثر باپ بیٹوں کو ایک ہی تھڑی پر لا کھڑا کرتا ہے لیکن پردہ دار سماج نقاب لئے کھڑا رہتا ہے۔ کیا مجال جو ایک کی دوسرے کو خبر ہونے دے۔

یہ پردہ سماج کی عقلوں پر پڑا ہے۔ یہ پردہ داری نہیں۔

حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔ صداقت کو نقاب پوش کرنا ہے۔

یہ پردہ داری نہیں۔ روشنی دکھانے والی شمع پر غلط شرم وحیا اور چشم پوشی کا دھندلا فانوس ڈھک کر گناہگاروں کی ہمت افزائی کرنی ہے۔

چشم حقیقت نگر کی آنکھوں میں مرچیں جھونکنا۔ سچ کو چھپانا اور دروغ کو فروغ دینا ہے۔

بیوقوف سماج تو نے رنڈی کو دشمن سمجھا۔ تو نے اس کے لئے صرف تاریکی میں گنجائش چھوڑی۔ تو نے اسے گندا سمجھا۔ گندا رہنے دیا اور ایک طرف لے جا ڈالا۔ تو نے اسے بیمار تشخیص کیا اور بیمار رہنے دیا ــــــ اس نے تیری دنیا تاریک کر دی۔ تیرا ماحول گندا کر دیا۔ ہر پاس سے گذرنے والے کو بیماری دی۔ اندھیرے نے یہ مزید فائدہ پہنچایا کہ رنڈی نے باپ کا ورثہ بیٹے کو پہنچایا۔

معاشرہ کی پردہ داری اس وبا کو پھیلانے میں معاون ہوئی۔

تاریکی نے انسداد سرقہ نہ کیا۔ چور کو دیدہ دلیر بنا دیا۔

سماج تو بیماروں کے لئے شفاخانہ کھولتا ہے۔ تو غلط کاروں کے لئے جیلخانہ بناتا ہے۔ تو ہر گندگی کی صفائی کا ذمہ دار ہے اور اپنا فرض ادا کرتا دیکھا گیا ہے۔ تو انسان کی جسمانی صحت کا خیال کرتا ہے۔ سڑی ہوئی ترکاریاں نہیں بکنے دیتا۔ لیکن تعجب ہے تو نے وہ بازار قائم کر رکھا ہے جہاں اخلاقی اور جسمانی بیماریوں کا بیوپار

ہو رہا ہے۔

سماج تو اندھا نہیں۔ بیوقوف نہیں۔ دیوانہ نہیں ہے۔ تو نے جو آجتک اس گندگی کو برداشت کیا۔ اب بھی کر رہا ہے اور آئندہ بھی کرے گا اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔ کوئی جذبہ ہے جو تجھے اس کے ختم کرنے سے روکتا ہے اور روکتا رہے گا۔

سماج! طوائف کی بقا اس میں مضمر ہے کہ تیرے بنانے والے رنڈی باز ہیں۔ معاشرہ کے سرپرست طوائف پرست ہیں۔ سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھنے والے ہاتھ۔ اپنی بُری عادتوں کے ہاتھوں دست زیرِ سنگ ہیں ——— آبائے شہر ہم سے ابنائے شہر کو کیا بچائیں گے خود ہمارے دامِ الفت میں گرفتار ہیں۔

رنڈی کا وجود اس وقت تک نہیں مٹایا جا سکتا جب تک مردوں کی طینت نہ بدل دی جائے۔ جب تک مرد بوالہوس رہیں گے طوائف دُنیا پر مسلط رہے گی ——— لیکن ہوس اور مرد مترادف ہیں۔ ان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہوس مرد کی طینت میں ہے۔ خلقت میں ہے۔ گوشت سے ناخن جُدا نہیں ہو سکتا۔ گدھ سے مُردار خواری نہیں چھڑوائی جا سکتی۔ خنزیر کو گندگی سے دور نہیں رکھا جا سکتا ——— بندر کو سدھایا جا سکتا ہے انسان نہیں بنایا جا سکتا۔ بید لئے کھڑے رہیئے کرتب دکھاتا رہے گا۔ ذرا چھوڑ دیجئے۔ قدغن اٹھا لیجئے۔ بید چھپا لیجئے فطرت عود کر آئے گی۔

مُردحیوان ہے اور حیوان رہے گا۔ منبر اور پلیٹ فورم پر ہوسِ عزّ وجاہ کے ورد کرتب کرواتے ہیں۔ سکھائے پڑھائے سبق دُہرواتے ہیں۔ منظر بدلا اور اس نے وحشت کی لی ——— یہ حیوان سرشت۔ وحشی نژاد، درندہ صفت اپنے پنجے سیکڑے دانت چھپائے حقیقت پہ عبا اور قبا کے پردے ڈالے گربہ مسکیں بنا پھرتا ہے ورنہ

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

رنڈی کے ہاں فریب کے پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ تلک کی لکیریں ماتھے پر سے دھو کر پاپ کے نشان دکھائے جاتے ہیں۔ یہاں خواہشات کے پنجوں سے گریبان پھاڑ کر سینہ کے داغ گنائے جاتے ہیں۔ جذبات کے خنجر سے سینہ چاک کر کے دل کے دھبّہ بتائے جاتے ہیں۔

خواہشات کی انگیٹھی پر ایک آنچ میں ملمّع اتار دیا جاتا ہے۔ یہاں دامِ تزویر نہیں چلتا۔ یہاں کھوٹا کھرے کے مولوں نہیں بکتا۔ یہ عُریانی کی دنیا ہے۔ ہمارے روبرو ہر شے برہنہ لائی جاتی ہے۔

آج عید ہے سڑکوں کی کچھ دن پہلے سے درستی کیگئی ہے۔ تمام داغ بھر دیئے گئے۔ عید کے دن ٹریفک زیادہ ہوگا۔ نئے زخموں اور داغوں کیلئے گنجائش بنائی گئی ہے۔

اندھیرے سے سڑکوں کو جھاڑ پونچھ دھو دھا کر تیار کر دیا گیا تاکہ دُنیا اسے دل کھول کر گندا کرے ـــــ ازانجملہ رنڈیاں بھی نہلا دُھلا سجا بنا کر بٹھادی گئیں ـــــ دُنیا کی عید ہے۔ ہر شئے صاف کی گئی ہے تاکہ دُنیا والے اسے گندا کریں۔ ہر چیز درست کی گئی ہے تاکہ ابنِ آدم اسے پھر سے توڑے ـــــ انسان آج بھی خورد سال بچّے کے مترادف ہے اور سماج اس کی ناز بردار دوا۔ کھلونے سجا کر رکھتی ہے تاکہ بچّہ آئے اور انہیں توڑے۔

سڑکوں کی بھی پہلے سے مرمّت کر دی گئی۔ آج ان پر ٹریفک زیادہ ہوگا۔ رنڈیوں کے بھی علاج رمضان بھر ہوتے رہے۔

ماہِ صیام میں ایک حکیم صاحب کے ہاں گئی تھی حکم آیا تھا۔ یہ ہمارے معالج ہیں۔ فوراً گئی۔ ان سے کام پڑتا رہتا تھا۔

احباب جمع تھے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ ایک صاحب بیٹھے دَوا کھرل کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا تیار ہو رہا ہے۔ فرمایا عید کے لئے دَوا۔ اس جواب کے ساتھ ساتھ زیرِ لب مُسکرائے بھی۔

یہ دَوائیاں بیچتے ہیں ہم حُسن ـــــ ہم اپنے رُخِ تاباں سے جذبات میں آگ لگاتے ہیں۔ یہ اپنے کُشتہائے سوزاں سے خواہشات کو بھڑکاتے ہیں ـــــ ہماری ادائیں دُنیا کو مائل بہ گناہ کرتی ہیں ان کی دَوائیں ـــــ چادڑی کی نائکہ رنڈی

کو بناتی سنوارتی ہے یہ تماشبین کو اُبھارتے ہیں۔
کام دونوں کا ایک ہے۔ ایک ذلیل سمجھی جاتی ہے ایک عزت دار۔
لیکن یہ مرضوں کا بھی علاج کرتے ہیں ——— کاش صرف اتنا ہی کرتے۔ یہ قابلِ پرستش ہوتے اگر اپنا دائرۂ عمل یہیں تک محدود رکھتے۔ یہ منجی کہلاتے اگر صرف بیماریوں سے نجات دلاتے ——— لیکن یہ ملذّذات بھی بیچنے لگے، فلک سیَر بھی۔ ان کے نام سے حیاسوز اشتہار بھی نکلنے لگے رسالہ بھی۔
دُنیا اسی کا نام ہے طب علاج الامراض تھی وجہ امراض بن گئی۔ اطباء بیماری کا شکار کرنے پیدا ہوئے تھے خود خواہشات کا شکار ہو گئے۔
مشاطۂ تمدّن نے جسے ہاتھ لگایا مبتذل بنا دیا۔
موتی کی آبرو کھوئی مروارید سیال بنایا ——— فولاد کو پھونک کُشتہ کر دیا۔ جوہرِ میدان جوہر دکھانے آیا تھا تخلیہ میں کام آیا۔
دُنیا کی ہر شے صنفِ قادر کی غلام ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے ——— لیکن اے دو روزہ عارضی قادر قدرتِ حقیقی اپنا کام کر رہی ہے۔ تو نے فولاد کی تلوار نہ بنائی۔ اسے پھونک دیا وہ تیرے قبضۂ قدرت میں تھا۔ غلام تھا۔ قدموں میں آن پڑا۔ لیکن اندھے آنکھیں کھول فولاد قدموں میں پڑا اور لے غلامی کی زنجیرِ گراں بن کر۔

تیری ہوس نے موتیوں کو پانی کر کے بہا دیا۔ وہ بوند ابرِ نیساں نہ بنی مبدّل بہ عرقِ انفعال ہوئی۔

دوا بن رہی تھی۔ عید کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ عیاشی کے آلہ گھڑے جا رہے تھے۔ طب سے دلالی کا کام لیا جا رہا تھا ــــــ یاقوت اور زمرّد۔ عصمت کا خون بہانے اور پارسائی میں زہر ملانے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔

ختن سے مشک لایا گیا تھا۔ کشمیر سے زعفران۔ خدا کی نعمتیں اکٹھی کر کے اہتمامِ گناہ کیا جا رہا تھا۔

سقنقور نیل فراہم کی تھی۔ سیاہ کار قلزمِ معصیت میں نہانا چاہ رہے تھے ــــــ پہاڑوں کے سینہ چیر کر سم الفار حاصل کی گئی تھی۔ ضمیر کو دائمی نیند سُلانے کی تدبیر تھی۔

ضمیر کو سُلانے والے تو قانونِ قدرت کو نہیں سُلا سکے گا یہ زہر تیرے اور تیری اولاد کے رگ ڈپے سے پھوٹے گا ــــــ زعفران کے کھیت میں جانے والے یہ خوشبو تجھے اتنا ہنسائیگی کہ تو رو دے گا ــــــ ہرن کی ناف چیر کر مُشک لانے والے یہ دَورِ عیش تجھسے رم کر جائے گا۔ چار دن کی چاندنی پر نہ پھول اندھیاری آنے والی ہے۔

کبوتر خصال۔ آشتی اندیش معاشرہ نے۔ گربہ پا نبرد آزما قدرت کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ تو بے خبر ہے اور وہ گھات میں۔

تو سوتا بنا ہے اور وہ شب خون مارنے تیار کھڑا ہے۔

تو ہلالِ عید دیکھ کر مسرور ہے اور دستِ قضا نے تیغِ آبدار سونت رکھی ہے۔

عید ہے۔ مہینہ بھر کے پیاسے مے آشام آج دل بھر کر دل کی لگی بجھائیں گے۔ کلیدِ میکدہ خمِ چرخ پر رکھی نظر آگئی۔ جام پر جام لنڈھائیں گے۔

دورِ پارسائی گذر چکا۔ ماہِ صیام نے اختتام پایا۔ دورِ معصیت آیا ہے۔ اب نیکیوں کا ردِّ عمل دیکھو۔

میں نے بھی کپڑوں پر چاندی بکھروا دی۔ مجھ پر سونا نچھاور کیا جائے گا سودا بُرا نہیں ہے سودائی آنے والے ہیں تیار ہو بیٹھ۔

زہرہ کے مشتری آئیں گے۔ مہینہ بھر کی نیکیاں گناہ کی بھینٹ چڑھائیں گے۔

معصیت کی دیوی الفریب بنکر بیٹھ تیرے پجاری آرہے ہیں۔

پاپ مندر کی داسی سنگھاسن پر براج۔ تیرے داس آئیں گے۔

چرنوں پر پھول چڑھائیں گے۔ تجھ پر روپا برسائیں گے۔

گاہک آئے اپنی اپنی پونجی لائے۔ بزرگوں کا اندوختہ۔ بیوی کا زیور۔ بال بچوں کا حق کاٹ کر لائے۔ ان کو رُلا کر لائے۔ کسی نے باپ کے صندوقچہ میں سے چُرایا کسی نے ماں کی تھیلی میں سے۔ ایک نے بہن کے جہیز کا دوپٹہ اُچکا لیا صرّاف کے ہاں کوڑے کر ڈالے۔ بہن

غریب نے تو عید کے دن اس ڈر سے نہیں اوڑھا تھا کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔

لوگ آتے رہے ٹیکس دیتے رہے۔ حسن برستا رہا۔ تھالی بھرتی رہی۔ اُستادوں کے گھر بے بھئے زہرہ کے پو بارہ۔

چھ بجے ہورن کی آواز آئی۔ میں سب کو چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پارٹی ہے۔ کاظم آئے گا۔ زہرہ جائے گی۔ نقصان کر کے جائیگی۔ گاہکوں کو بگاڑ کر جائے گی —— یہ دل کے سودے ہیں یہ سودا ہی اور ہے۔ یہاں کھونے میں مزا ہے۔ ہم اندھے جواری ہیں۔ ہر رنڈی جواری ہے راجہ نل نے عزت لگا دی۔ جواریوں میں نام کر گیا۔ سچ پوچھو تو ہر طوائف راجہ نل ہے۔ اس بساط پر عزت اور عصمت کا سرمایہ لیکر آتی ہے اور اندھی جوارن قدم قدم پر لگاتی چلی جاتی ہے۔

میں باغ پہنچی۔ کاظم موجود تھا۔ ایک صاحب آگے بڑھے اور بولے۔

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسم دُنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

یہ شعر یقیناً جناب نے آج صبح سے کئی مرتبہ رہرسل کیا تھا۔ لیکن گھٹیا کمپنی کے بُرے ایکٹر کے انداز سے پڑھا۔ میں نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

رنڈی شرما رہی ہے۔ اور گلے ملتے ہوئے قربان جایئے ایک ایک آتا گیا ملتا گیا۔ جیسے ہوٹل کی میز پر سے کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ میں ساڑی کو بار بار درست کرتی رہی جیسے بہرہ

ہر گاہک کے بعد میز جھاڑ دیتا ہے۔

کاظم دور کھڑا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ لیکن وہ ٹل گیا ایک روش پر ٹہلنے نکل گیا۔ میری نگاہیں مایوس لوٹیں اور پلکوں کی سیاہ چادر میں لپٹ گئیں۔ میں کاظم کے تصوّر میں سب سے گلے ملتی رہی۔ لیکن احساسات جاگ رہے تھے۔ دل کی آنکھیں کھلی تھیں کاش وہ بھی بند ہو جائیں اور زہرہ صرف گلے ملنے کی مشین بن کر رہ جاتی۔

کوئی تکلّف سے مل رہا تھا۔ کوئی بھیچ بھیچ کر۔ کسی نے عطر مَل رکھا تھا لیکن مُنہ کی بدبو نہ چھپا سکا۔ ایک کے بٹن سینہ میں چُبھے۔ ایک سنڈے نے زمین سے اُدھر اٹھانا چاہا۔ غرضکہ زہرہ چند ے دست بردِ خلائق میں رہی۔

سُنا ہے حوریں روزہ داروں کی خدمت کو آتی ہیں۔ ہماری متمدن دُنیا منّت کشِ مخلوقِ فلکی نہیں۔ حوروش مہیّا کر لیتے ہیں۔ اس امید موہوم پر ان حقیقت پرستوں کا ایمان نہیں۔

عید کا دن ہے لوازماتِ عید پورے ہونے لازم۔ بوتلیں کھلیں جام گردش میں آیا۔ دُنیا لڑکھڑائی۔ زہد و ورا کا سر چکرایا۔ زہرۂ زمین نے رقاصۂ فلک کو ٹھکرایا۔

بزمِ طرب دیکھ کر فلکِ طرب دشمن کے سینہ پر ستارہ آبلوں کی طرح نمودار تھے۔ بےگناہ خاکیاں پر فلکِ پیر آنسو ٹپکا رہا

تھا شہابِ ثاقب برسا رہا تھا۔
دنیا کے عیش دیکھ کر کروبیاں کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں یا داروغۂ دوزخ نے انگارے تیار کئے تھے۔ آسمان کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ یا پیش رفتگاں وار فتگاں کے مشاغل دیکھ رہے تھے۔ کہ زہرہ نے یہ غزل شروع کی:-

ساقی بیار بادہ کہ ماہِ صیام رفت
دردہ قدح کہ موسمِ ناموس و نام رفت

غزل زبان پر صُراحی ہاتھ میں گھونگرو پیروں میں بندھے تھے۔ میں گاتی جاتی۔ ناچتی جاتی پلاتی جاتی چھکاتی جاتی تھی۔ پی رہی تھی پلا رہی تھی۔ بتوا تھی نشیہارا بنا رہی تھی۔
جام ہاتھ میں تھا، شراب ہونٹوں پر۔ سر گلے میں مچل رہے تھے۔ رقص پیروں پر کھیل رہا تھا شیطنت کا بھوت سر پر۔
میں یہ شعر گاتی ہوئی کاظم کی طرف بڑھی:-

وقتِ عزیز رفت بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضور صُراحی و جام رفت

اس کے پاس جا بیٹھی۔ میں نشہ میں تھی۔ بُری بھلی شراب کے سر جائے گی۔ رنگی ہوئی ہوں رنگ کر اٹھوں گی۔ بدنام جام ہوگا۔ مُنھ سے گلاس لگا دیا۔ اس نے انکار کیا۔ میں نے یہ شعر گایا۔

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
انداز رہ نیاز بدار السلام رفت

اہلِ بزم نشہ میں چور بست پینے پلانے پر کمر بستہ میری حمایت پر آمادہ۔ کاظم مجبور ہو گیا۔ پے بہ پے کئی پینے پڑے۔ میر اسہار الے کر اٹھا۔ ہم دونوں استادوں کے روبرو جا بیٹھے ظالم نے ایک عجب انداز سے یہ شعر گایا:۔

نقدِ دلے کہ بود مرا صرف بادہ شد
قلبِ سیاہ بود از اں در حرام رفت

اس کے بعد فوراً یہ غزل شروع کی:۔

دل دو نیم شدہ دلبر بملامت برخاست،
گفت ہا مانشیں کز تو سلامت برخاست
کہ شنیدی کہ دریں بزم دمے خوش بنشست
کہ نہ در آخرِ صحبت بندامت برخاست

مجھے کامیابی کا نشہ چڑھا تھا کاظم کو پلائی تھی۔ اس نے ختم کی اور میں نے شروع:۔

مے پرستوں میں جو گھر جائیے گا
بچکے مستوں سے کدھر جائیے گا

لالہ رخساروں میں گر آئیے گا
داغ سینہ پہ مگر کھائیے گا

ہاتھ گل پر جو پڑے گا صاحب
خار سے بچکے کدھر جائیے گا

میکدہ ہے یہ نہیں ہے مسجد
چھینٹے دامن پہ لئے جائیے گا

کاظم پرہیز کرنے لگا۔ گریز کرنے لگا محفلوں سے کنارہ کشی اختیار کی جلسوں میں آنا جانا چھوڑ دیا۔
میں صورت کو ترس گئی۔ جتن وہ کونسا باقی تھا جو کیا نہ گیا۔ پادری صاحب کو بھی اُکسایا خورشید کو بھی۔ پردہ کسی کی باتوں میں نہ آیا۔ ہر ایک نے جواب صاف پایا۔
کاظم کو پلانے والی تشنۂ دیدار رہی۔ آنکھیں اسے ڈھونڈھتی رہیں۔ طبیعت بے قرار رہی۔
آخر کو ٹوہ لگائی کہ وہ آتا جاتا کہاں ہے معلوم ہوا سیر و تفریح کو گھر سے نکلتا نہیں۔ اگر کوئی کام ہوتا ہے تو باہر جاتا ہے ورنہ دن بھر بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا ہے۔
پادری صاحب نے پوچھا کہ آخر اس درجہ انہماک کیوں۔ بولا بہت گنوادی تھوڑی رہ گئی۔ کچھ سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ پادری جی تو سکھائے پڑھائے تھے بولے وقت سے پہلے بڑھے ہوئے جا رہے ہو۔ ارشاد ہوا کبھی کبھی تو میں بھی سوچتا ہوں کہ ابھی وقت باقی ہے ایک دفعہ پھر خانگی دُہرالوں۔ دورِ ماضی کو واپس بلالوں۔

بھولا ہوا سبق یاد کر لوں۔ بابِ عیش پھر کے سے پڑھ لوں، مُرقعِ حیات
میں رنگ بھر لوں۔ عالمِ رنگ و بو کی ایک دفعہ پھر سیر کر لوں۔
لیکن کوئی طاقت ہے کہ روکتی ہے۔ پکڑتی ہے۔ آگے
جانے نہیں دیتی۔ قدم اُٹھانے نہیں دیتی۔ کانوں میں آواز آتی۔
کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام۔
اور گاؤں بھی وہ جہاں جنسِ وفا نہیں۔ بوئے حیا نہیں۔
جس گاؤں کو بقا نہیں۔ عیش دو روزہ عشرتِ یک شب شبنم
کا موتی۔ کاغذ کا پھول۔ آنچ کی سہار نہیں۔ اُڑ جائے جھلس جائے۔
اس قطرہ سے لگی کیا بجھاؤں جو چشمکِ آفتاب کی تاب نہ لا سکے۔
اُس گُل سے کیا دل بہلاؤں، جو دیکھو تو سب کچھ ٹٹولو تو ہیچ۔
اور صاحب قوم میں جوان بھی ہیں پیر نابالغ بھی۔ چند
جوانانِ کہن سال بھی رہنے دیجئے ان کی ضرورت ہے۔
یہ سب باتیں پادری صاحب نے سُنائیں۔ وہ آجکل اکثر آتے
جاتے رہتے ہیں میرے مونس و غمگسار ہیں۔ یار و مددگار ہیں۔
اور کچھ نہیں تو ان سے کاظم کی باتیں ہی کر لیتی ہوں۔

کافی ہے تیرا نام بھی تسکینِ قلب کو
گر تو نہ بزم میں ہو تری گفتگو رہے

Odein میں بڑا اچھا فلم آیا ہوا تھا۔ میں نے پادری صاحب کو
گانٹھا اور اس پر راضی کر لیا کہ کاظم کو لے کر جائیں۔ میں بھی پہنچ جاؤنگی۔

اُس کم فرصت وبلیش کار کو فرصت نہ ملی۔ پادری صاحب ناکام واپس آئے۔ مَیں نے کہا پھر سہی۔ فرمایا وہ فلم دیکھتا ہی نہیں۔ مَیں نے کہا یہ کیوں۔ بولے صاحب وہ اپنے دماغ کا ایک ہی ہے۔ میں نے حُجّت کی تو غالبؔ کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں

مَیں نے کہا اس شعر کو سنیما نہ جانے سے کیا تعلّق۔ پادری صاحب بولے کیا عرض کروں یہی مجھے بھی خیال ہوا تھا۔ لیکن اُس منطقی نے اسی شعر سے استدلال کیا اور میں مان گیا۔ کہتا ہے پہلے تو عکسی تصویر لی جائے۔ پھر اس عکسی تصویر کا عکس پردہ پر ہم کو دکھایا جائے۔ اس غیبِ غیب کے ہم قائل نہیں۔

دانشمندوں کا طبقہ عوام کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ سیب کے بدلہ سیب کی تصویر فروخت فرما رہا ہے۔

روٹی نہیں دیتا اس کی پرچھائیں دکھا رہا ہے۔ اللہ رے عقل کی ابلہ فریبیاں۔ پانی پلاتی نہیں۔ پانی کے دام وصول کر لیتی ہے اور لطف یہ کہ پیاسا بھی مطمئن۔

اگر اس چابک دست بازی گر کی یہی کرشمہ کاریاں رہیں تو

ع۔ دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں۔

ہر شئے سایہ اور پرچھائیں بن کر رہ جائے گی۔ جنّتِ نگاہ

لیکن حقیقت سے دور۔ فطرت کش۔ خلقت سوز ـــــ دماغ مسحور ہو گا جسم بھوکا۔

خرد انسانی کا جادو گر آب سرد کے دریا بہائے گا ـــــ دماغ جھک جائیں گے۔ ہونٹ خشک رہ جائیں گے۔

یہ ساحرِ رزق کے انبار لگائے گا۔ نیت اسیر ہو جائے گی۔ جسم بھوکا مر جائے گا۔

سامریئے خرد کے بنائے ہوئے سنپولئے اس سماج کو ڈس لیں گے ـــــ ایک موسیٰ کی ضرورت ہے جو اس ڈھٹ بندی کو توڑ دے۔ اس زرّیں گوسالہ کی حقیقت عریاں کر دے۔ یہ پردہ چاک کر ڈالے۔

ابھی تو یہ عکس کاریاں سیر و تفریح تک محدود ہیں۔ وہ دن دُور نہیں جب ضروریات پر چھا جائیں گی ـــــ دُنیا جنّت بن جائے گی۔ روٹی خود اُڑ کر آپ کے ہونٹوں تک آئے گی۔ لیکن یہ جنّت الحمقا ہو گی۔

پادری صاحب بیان کر رہے تھے اور میں دل کے پردہ سیمیں پر کاظم کاٹو کی فلم دیکھ رہی تھی۔

جب وہ چُپ ہوئے تو میں نے کہا۔ کہے جائیے۔ وہ بولے اور یاد نہیں۔ اس فقرہ سے میں چونک پڑی۔ آنکھ کُھل گئی خواب خوش آئندہ ختم ہوا۔ کاظم کی پرچھائیں غائب ہو گئی۔

دل کا پردہ کسی بیوہ کی ردا کی مانند بے رنگ رہ گیا۔ کچھ سایہ
آئے تھے گذر گئے۔ کاش یہ دُنیا صرف سایوں اور پرچھائیوں
کی دُنیا ہوتی۔

وہ بچتا رہا مَیں درپے رہی۔ وہ چھپتا رہا میں ڈھونڈھتی رہی۔
عجب آنکھ مچولی تھی۔ لومڑی شیر کی تاک میں تھی شیر چھپ رہا
تھا۔ زہرہ کاظم کی تلاش میں تھی کاظم بچ رہا تھا۔ پیادہ شہ پر کشت
دے رہا تھا شہ اعراب لے رہا تھا۔

پیادہ جانثار ہے۔ شہ پر خوفِ شکست سوار ہے۔ بساط بچھی
ہے۔ اپنی اپنی بساط مطابق چالیں چلی جا رہی ہیں۔ نقشہ بنتے ہیں
بگڑتے ہیں۔ ہوا رُخ بدلتی ہے۔

پیادہ! اگر شہ کو زچ کرنا ہے تو خود بھی فرزیں بننا پڑے گا۔
راستہ موجود ہیں خانہ خالی۔ چال چل اونچے گھر میں جا بیٹھ۔
موتیوں کی خواہش ہے تو ہنس کا برن لے۔ رُخِ گلعذار تک
پہنچنا ہے تو گلگونہ بن۔ شاخ طوبےٰ کی طلب ہے تو سدرہ نشین ہو۔
زہرہ! اگر چاہتی ہے کہ اپنی شاخوں میں آشیانہ کبک دیکھے
تو اتنا کھچ کہ سروِ بالا بن جا ——— خواہ اس کشش میں تیرے اعصاب
چٹک جائیں۔

دُنیا مُفت کچھ نہیں دیتی۔
ہما بناتی ہے تو ہمجنسوں سے چھڑا دیتی ہے۔ عقاب کے عقب

میں گوشۂ تنہائی مقدر کرتی ہے۔ یوسفؑ کو تاج و تخت بخشا کنوئیں
جھنکا کر موتی کو آبرو دیتی قبرِ صدف اُٹھا کر۔ دانہ دانہ تسبیح بنا سینہ
چھدوا کر۔

زہرہ کاظم تک پہنچ سکتی ہے مگر دقتیں اُٹھا کر۔

سنیما وہ جاتا نہیں میرے گھر آتا نہیں۔ کسی دوست سے
پروبال ملاتا نہیں۔ اب میں ملوں تو کیونکر۔

زہرہ غائب شطرنج کھیل سکتی ہے۔ مگر مہرہ بساط سے باہر
ہے زد پڑے تو کیسے۔

مہینوں گذر گئے اس کی صورت نہیں دیکھی معالج وقت میرا
علاج کر نہ سکا۔ یہ مرہم زنگار و کافور میرے زخم بھر نہ سکا۔

صبح و مسا یاد آتی ستاتی چلی جاتی لیکن پھر آتی اور تیز و تند
ہو کر۔ جیسے دھارا رُکتا ہے تو طوفان بن کر آتا ہے۔ آنسو تھمتے
ہیں تو دل کے بند توڑ کر نکلتے ہیں۔

صبح اپنا پنبہ سفید میرے زخم دل پر رکھتی۔ شام کو اُسے
سُرخ پاتی۔ رات کالٹورا سا دھو سحر ہندی لاتا۔ اپنی ہتھیلی کے چھٹے
بٹے دکھاتا لیکن کچھ کر کے نہ دکھاتا۔

وقت کا ابلق ہاتھ ذہن کی تختی صاف کرتا لیکن اس آواز پر
چونک پڑتا کہ :۔

یہ وہ سبق ہے جو بھولے سے سوا یاد رہے۔

ایک دن خبر ملی کہ آل انڈیا مشاعرہ ہونے والا ہے۔ پردہ کا بھی انتظام ہے۔ کاظم ضرور جائے گا۔

وہ شاعر نہیں تاہم شعرا، میں مصرعہ طرح کی طرح گھرا رہتا ہے۔

خورشید صاحب آئے ہیں نے کہا سنا ہے مشاعرہ ہو رہا ہے۔ بولے چلو گی ہیں نے کہا ضرور۔ فرمایا کاظم صدارت کر رہا ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سنی ان سنی کر دی۔

پنڈال جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ ڈائس پر شامیانہ تنا ہے۔ رضا کار مصروفِ کار ہیں۔ منتظمین بھاگے دوڑے پھر رہے ہیں۔ کاظم آن پہنچا ایک طرف کو ہو بیٹھا۔

سب باتیں کر رہے ہیں وہ خموش۔ لب بند بیٹھا ہے لیکن ساکت ہونٹ کہہ رہے ہیں کہ ہم میں گفتگوئیں پنہاں ہیں۔ ع

اِک ذرا چھیڑ کے دیکھو ابھی کیا ہوتا ہے

اطلاع آئی کہ ایک شاعرِ غرّہ بگڑ گئے۔ پی کر بکھر گئے۔ کچھ مزید مطالبہ کرتے ہیں ورنہ مشاعرہ میں آنے سے قطعاً انکار۔

ماشاء اللہ یہ تو بھرپور رنڈیوں والا داؤں ہے۔ لیکن ایک فرق ہے۔ ہماری نائکہ یہ باتیں کرتی ہے، یہ خیر سے خود بھاؤ تاؤ کر لیتے ہیں۔

مشاعرہ شروع ہوا کاظم نے مختصر سی صدارتی تقریر کی۔ سامعین کو بتایا کہ آج وہ شعر کی ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنی چاہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں فصل

ہے۔ الگ الگ موزوں ہیں لیکن مل کر معنی دیتے ہیں۔ اگر کسی مصرعہ کا ایک لفظ بھی دوسرے مصرعہ میں ڈال دیا جائے تو دونوں ناموزوں ہو جائیں گے۔ توازن میں فرق پڑ جائے گا۔ لیکن معنی اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب یہ دونوں مل جائیں۔ مفہوم شاعر آپ تک ان دونوں کی مواصلت ہی سے پہنچ سکتا ہے ——— اسی طرح شاعرِ ازل کا مُدّعائے حقیقی فرق کے اتحاد میں مضمر ہے۔ اگر تخلیقِ عالم کے معنی آپ خبط نہیں کرنا چاہیئے تو شعر کی مانند شعور کی کڑیوں میں منسلک رہیئے۔ ورنہ صحیفۂ حیات شعرِ بے معنی و مصرعہائے دو لخت ہو جائیگا۔

نامی گرامی شعراء کلام سُنانے لگے۔ ان میں کچھ جامی بھی تھے لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور بہکی بہکی باتیں کر کے چلے گئے۔ بار بار کہتے تھے، اتر گیا پڑھا نہیں جاتا، واللہ اعلم اس ترنّم نواز کا گلا اتر گیا تھا یا نشہ۔ نہیں معلوم یہ دُنیا کے سامنے خود کو قاری کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا یا شاعر کی ——— اپنے کلام کی داد چاہتا تھا، یا لحن کی ستائش۔

مُنہ میں سے شراب کا کچھ ایسا بھپکا آ رہا تھا کہ میں نے کاظم کو بار بار رومال ناک تک لے جاتے دیکھا۔

ایک مرتبہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مَیں اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا ہوں میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا کہ اس کی شکایت تو والدہ سے کیجئے۔

اس شاعر خود فراموش کے بعد کاظم نے سامعین کو مخاطب کر کے کہا۔

ہمارے کرم فرما حضرت جامؔ کا کلام شرابِ سر جوش سے کم نہ تھا شراب کا جوش تو آپ نے دیکھا اب خمارؔ کی باری ہے اور ان الفاظ کے ساتھ حضرتِ خمارؔ کو اشارہ کیا۔

ایک صاحب نے رباعیاں شروع کیں معلوم ہوتا تھا کہ تا قیامِ ربع مسکوں انکا اختتام پذیر ہونا امرِ محال ہے ——— کاظم نے سامعین کو مخاطب کر کے کہا۔ بندہ نواز جناب والا کا کلام امنڈتا ہوا سمندر۔ بہتا ہوا دریا اور طوفان تخیل ہے جسے روکا نہیں جا سکتا۔ ایک رباعی کی داد دیتے ہوئے کہا۔ جزاک اللہ۔ ایک نہ ختم ہونیوالا سبق ہے۔ سب ہنس رہے تھے اور وہ پڑھے جا رہا تھا۔ تہیہ کر کے آیا تھا کہ عمر بھر میں جتنا لکھا ہے آج سامعین پر نازل کر کے اُٹھوں گا۔

سامعین اکثر بانگ لگاتے کہ گا کر پڑھیئے ——— مشاعرہ مجرے کے مترادف بنا تھا۔ اکثر شعرائے کرام نہ صرف گاتے بلکہ خیر سے بتاتے بھی تھے اور ان کو داد زیادہ ملتی تھی۔

پسند عام کی طلب علمبرداران علم و ادب کو نچا رہی ہے اور وہ ناچ رہے ہیں۔

یہ قوم کے رہبر ہیں۔ ہادی ہیں۔ اپنے کو مصلح کہتے ہیں۔ مذاقِ ملت درست کرنا اپنا مشن قرار دیتے ہیں۔ لیکن دو گھڑی کی واہ واہ کیلئے گانے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور ناچنے کو بھی تیار۔

رنڈی یہ سب کچھ پیٹ کے مارے کرتی ہے اور یہ نفس کی خاطر۔

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

زہرہ کی راتیں کہاں کہاں گذریں یا زہرہ جانتی ہے یا چپہ چپہ زمین۔ رات باغ میں کٹی سویرے آنکھ کھل گئی ہر چیز منہ سے بول رہی تھی۔ کہ یوں گردش میں جامِ بے خودی انجام پاتا ہے۔ میں بھیرویں کے سُر گنگناتی چھت پر نکل گئی۔

دیکھتے دیکھتے شہِ مشرق نے۔ زہرہ مشتری۔ بنات النعش اور دخترانِ فلک کی آبرو لے لی۔ پھر انگڑائی لے کر اُٹھا اور شبنم کے موتی رولے۔

شہد کی مکھیاں تاریک چھتّے سے نکل پڑیں۔ پھولوں کا رس چوس لیا۔ شاہدِ گل پہ بھونرا منڈلانے لگا۔ نسیم سحر نے چشمہ کا سکون چھین لیا۔ پتّے شاخوں سے جھڑ گئے۔ طیور گھونسلوں سے اُڑ گئے۔ خوشبو نے آشیانہ رنگ و بو چھوڑ دیا۔ چمن میں لٹس سی مچ گئی۔ پرند پر افشاں اوراقِ گل پریشاں نظر آئے۔ میرے منہ سے نکلا۔ ع

اسی کو صبح کہتے ہیں تو رنگِ شام کیا ہوگا

برابر والے باغ میں ایک مرد اور ایک عورت کھڑے ہیں کچھ لین دین ہو رہا ہے۔ ہمت مردانہ نسائی عصمت کی قیمت ادا کر رہی ہے۔

دوسری طرف حُسن و عشق جدا ہو رہے ہیں۔ عشق کو دفتر جانے کی جلدی ہے حُسن کو گھر۔

گھوسی نے کٹڑہ بھینس کے تھنوں سے لگا دیا۔ جب ماں کے دودھ اُتر آیا تو بچہ کو کھونٹے سے باندھ سب دُوہ لیا۔ انسان اپنا کھلایا پلایا وصول کر رہا ہے۔

دریا کنارہ دُھواں اُٹھا۔ کوئی لاشہ پُھنکا۔ فیکٹری کی چمنیوں نے بھی دُھواں دیا۔ یہاں زندہ انسان جھونکے جا رہے ہیں۔

قمری سرو پر سے اُڑ دانے کی کونڈی پر جا بیٹھی۔ بھونرا دستِ گلچیں کے ڈر سے گل کو چھوڑ گیا۔ لطیف جذبات پر قاہر فطرت غالب آگئی۔

ٹھیکیدار نے درختوں کو ہلا ہلا کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر کچا پکا میوہ توڑ لیا۔ جو پھل شاخ سے یوں جُدا نہ ہو سکا اس پر لکڑیاں برسیں۔ صبح ہو گئی ہے۔ منڈی بانا ہے۔ جانور غلیلوں سے بھگائے جا رہے ہیں۔ اذنِ عام ہے کہ کویل آم پاس پھٹکنے نہ پائے۔ طوطا امرود پر نہ گر سکے۔ انگور کے خوشوں پر تھیلیاں چڑھا دی گئیں۔ انکی حفاظت ہو رہی ہے انہیں بیچا جائے گا۔

میوہ کو سڑے ہوئے متعفّن پانی میں دھو ٹوکرے میں سجا۔ پنّی
چپکا گیندے کے دو چار پھول اِدھر اُدھر لگا۔ دیدہ زیب بنا بازار
میں روانہ کر دیا۔ گھوسیوں نے کچّے گدلے گندے پانی کے دُو دُو
ڈونگے دودھ کی ہٹلویوں میں ڈال لئے —— تول میں پورا اُترے
اندر چاہے زہر ہلا ہو۔

صبح اپنے ساتھ یہ تاریکیاں لائی تو رنگِ شام کیا ہو گا۔
زاغ و زغن باز و جرعہ شکار کی تلاش میں آشیانوں سے برآمد
ہوئے —— چھاونی میں بگل بجا۔ بنی آدم ایک دوسرے کو مارنے
کے طریقے سیکھنے اپنی اپنی بارکوں سے نِکلے۔ ان کو اسی کام کی
روٹی دی جاتی ہے۔

نیّرِ اعظم کے دستِ پردہ در نے عروسِ ہستی کی نقاب
تار تار کر دی۔ شاہدِ حیات کو عُریاں کر ڈالا۔ چادرِ شب چاک کر دی۔
حجابات اٹھا دیئے —— اس استبداد کا نتیجہ اس ہوس
پردہ دری کا ماحصل یہ ملا کہ بھیڑیوں نے بھیڑ کے روپ میں درس
دیئے۔ رہزنوں نے رہبروں کے برن لئے۔

دُنیا کے چہرہ سے نقابِ شب ہٹا لیا گیا اس نے ردائے
تزویر تان لی۔

سماج کا برق انداز مہرِ درخشاں اپنی روشن لالٹین لیکر نِکلا۔
بدمعاش شریف صورت بن کھلے ڈلے پھرنے لگے۔

واقعاتِ شب کے شاہد ابن آدم نے ہٹا دیئے مٹا دیئے۔ سیجیں جھڑ گئیں۔ کشتیٔ ایش (Ash tray) جو عیش شبانہ کی داستان سُنا رہی تھی صاف کردی گئی۔ گلاس دھل گئے۔ بوتلیں پھک گئیں۔ پروانوں کی راکھ تک سمیٹ لی گئی۔ دِن نکل آیا چراغ گُل کر دیئے گئے۔ جو شمعیں تمام شب چشم و چراغِ بزم رہیں ان پر سماج کے ہاتھ نے فانوس ڈھک دیا۔

بولیاں چرخ بھی چھپ گئیں لعبتانِ بزمِ رنگ و بو بھی۔ دِن ہو گیا۔ حقیقتوں پر پردہ ڈال دئے گئے۔

سامنے سے ایک عورت چادر لپیٹے گذری۔ دوسری برقعہ میں تیسری ڈولی میں۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ یہیں رنڈی عریاں ننگی۔ ننگِ نسائیت۔ یہ بیوی بنو بیگم ——— واجب التعظیم ——— لیکن زہرہ کی چشم حق نگر میں یہ سماج کے کندھوں کا بوجھ ہیں۔ بے دست و پا۔ دوسرے کے سہارے پر چلنے والیاں۔ حیاتِ نیم مردہ۔ جلی فش۔ گھونگے میں بند۔ اپنی ہستی سے نا آشنا۔ خودی سے بے خبر۔ پردوں میں ملفوف۔ حجابات میں پنہاں۔ ہوا سے محروم۔ روشنی سے نا آشنا۔

چرلوں کی داسیاں۔ مردوں کی لونڈیاں۔ باورچیخانوں کی زینت۔ یہ گلاب کے پھول ہیں گلاس کیسز میں۔ تاج محل ہیں غلافوں میں پنہاں۔ موتی ہیں سیپیوں میں بند۔ صنعت صانع کے نمونہ ہیں

مرد کے قبضۂ لاشریک میں۔

جذبۂ خودی سے محروم۔ خود فراموشی کی تصویر۔ تذلیل انسانی کی انتہا۔ جبر کا مرقّع۔ قدر کی مجسّم تردید۔

یہ عورتیں تخیل شاعر ہیں بیان سے محروم۔ نالۂ نے ہیں نا آشنائے نفس ـــــ وہ نفس جو مرکز حیات ہے۔ جو مفہوم زندگی ہے۔ جس میں حقیقتِ ہستی مضمر ہے۔ جس کی ٹھوکروں میں زندگی ہے۔ جس کے ایک دم پر عمر خضر نثار ـــــ وہ نفس جس سے حیات خود مختار عبارت ہے۔ وہ نفس جو نفس آزاد کہلاتا ہے ـــــ وہ نفس جو سہارا نہ لے۔ سفرِ حیات میں محتاج خضر و نوح نہ ہو۔ چشمۂ حیات کو ظلمات جانے۔ کوہ جودی کو برگِ کاہ گردانے۔ جو غرقِ آب ہونا ترنے سے بہتر جانے۔ جو شرمندۂ ساحل ہونے سے ڈوب مرنا اولےٰ مانے۔

وہ نفس جو ببانگِ دہل کہتا رہے:۔

حقا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است

رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

طوفان آیا تھا چلا گیا۔ موجیں چڑھی تھیں اتر گئیں۔ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے تھک کر سر ایک ٹھنڈے اور سخت ستون پر ٹکا دیا ـــــ کاش یہ سر کسی سینہ پر ٹکتا۔ مضبوط۔ طاقتور۔ بوجھ اٹھانے والے بھرے ہوئے سینہ پر ـــــ اُس سینہ پر ٹکتا جو میرے لئے سینہ سپر ہو جاتا۔ خون بہا دیتا۔ وار کھا لیتا۔ جس سینہ پر میں بے ہوش ہو کر گر سکتی اور

اپنے کو محفوظ سمجھتی۔ اس سینہ پر جو عورت کی جنّت ہے ایک شوہر کے سینہ پر۔

پیچھے سے خورشید آپہنچا۔ دونوں ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کرلیں۔ میرا سَر ستون سے ہٹ اس کے سینہ پر جا ٹکا ____ اس عارضی سہارے میں ایک راحت تھی۔ میں نے بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح اسے غنیمت سمجھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں سے آنسو چھلک پڑے۔

خورشید نے سراسیمہ ہو کر پوچھا کیا بات ہے۔ مَیں نے اس کے شانہ کا سہارا لیتے ہوئے کہا ____ خورشید زہرہ تھک گئی۔ خدا معلوم کب تک یہ جانِ ناتواں اور یہ جَسَدِ مضمحل۔ ہر لحظہ بپائے دگرے پابستی کا مصداق رہے گا۔

خورشید نے درخواست کی میں نے منظور کر لی۔ زہرہ مسز خورشید بن جائے گی۔ آفتاب کے قریب آئے گی۔ احتراق[1] ہو گا۔ اپنی ہستی فنا کر دے گی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ عورت کی بقا اسی میں مضمر ہے۔

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
24346
26.1.59.
SRINAGAR

---

[1] اصطلاح نجوم میں زہرہ کا آفتاب سے ہم بُرج ہو کر پوشیدہ ہو جانا ہے۔

THE UNIVERSITY OF KASHMIR
ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN